میں گناہگار تو نہیں

سات سچی، سنسنی خیز، ہولناک اور ایمان افروز کہانیاں

عنایت اللہ

پیش لفظ

یہ مجموعہ ایسی سات سچّی کہانیوں کا ہے جو ذہن میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ یہ ہمارے اپنے معاشرے کے واقعات اور حادثات ہیں۔ اِن کے کرداروں کو آپ بڑی اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اِن سے زیادہ سنسنی خیز اور ہولناک واقعات ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی واقعہ کسی اخبار کے لیے چھوٹی سی خبر بن جاتا ہے جسے ہم تھوڑی دیر بعد بھول جاتے ہیں۔ کچھ دن چنڈال چوکڑیوں میں یہ واقعہ سُنا اور سُنایا جاتا ہے پھر کوئی اور حادثہ ہو جاتا ہے جو پچھلے واقعات کے قصّے ذہن سے اُتار دیتا ہے۔

ہمارے ہاں ایسے واقعات اور حادثات کا پس منظر قلم بند کرنے کا رواج نہیں۔ ہمارے قلمکار گھر بیٹھ کر لکھنے کے عادی ہیں۔ وہ زندگی کو قریب جا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ گھر بیٹھ کر وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ حقیقت سے ہٹے ہوئے افسانے ہوتے ہیں۔ ہم نے "حکایت" کے لیے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ ہمیں سچی کہانیاں اور ہر کہانی کا پس منظر جسے کہانی کے کرداروں کے سوا کوئی نہیں جانتا، ملتا رہتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں لیکن ہم دشواریوں کے باوجود کہانی کو اُس کی حقیقی شکل میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

انگریزی زبان کی سنسنی خیز کہانیوں کا ترجمہ کر لینا اور زیادہ آسان ہے لیکن جو سنسنی خیزی ہمارے اپنے معاشرے میں خصوصاً دیہاتی معاشرے میں ہے اس میں قاری کو کچھ سوچنے کا اور کچھ سمجھنے کا مواد بھی ملتا ہے۔ مثلاً اِن سات

کہانیوں میں آپ کو ذہنی تفریح کے علاوہ کچھ ایسے کردار بھی ملیں گے جنہیں آپ دیکھنا چاہیں گے۔ اِن کہانیوں میں آپ کو نیکی بھی ملے گی، بدی بھی، اور اِن دونوں کا تصادم بھی ملے گا۔ آپ دیکھیں کہ فتح کس کی ہوتی ہے۔

اِن میں دو کہانیاں عجیب وغریب جرائم کی بھی ہیں۔

آپ یہ کہانیاں پڑھ کر خود محسوس کریں گے کہ یہ بچّوں کو بھی پڑھنی چاہئیں۔

عنایت اللہ
مدیر "حکایت" لاہور

فہرست

اللہ گواہ ہے

راوی: شامو دادا

تحریر: اشرف علی مراد

اگر شامو دادا اپنی عمر صحیح بتا رہا ہے تو وہ پچھلی صدی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش کا سال ۱۸۹۴ء بنتا ہے۔ ہمارا ملک، خاص طور پر ہمارا دیہاتی علاقہ کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک سے ایک کردار ایسا ملتا ہے جس کا ماضی جذباتی، سنسنی خیز اور عبرت ناک ناول کا پلاٹ ہے۔ شامو دادا جو اپنا نام شام دین بتایا کرتا ہے، ایسا ہی ایک کردار ہے۔

شامو کو گاؤں کے دادے بھی شامو دادا کہتے ہیں۔ اس کا نام شام دین نہیں، ہشام الدین ہوگا۔ خاموش سا آدمی ہے۔ گاؤں کے بچوں کے ساتھ بہت پیار کرتا ہے۔ اس کی عمر ۸۶ سال ہے۔ اُس کے ایک بیٹے کی عمر چالیس سال ہے جس کی بڑی اچھی کھیتی باڑی ہے۔ شامو دادا اُسی کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کی قسمت میں سکول نہیں لکھا گیا تھا۔ وہ غریب ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ وہ زمانہ جب شامو دادا سکول جانے کی عمر کو پہنچا تھا، تعلیم کا زمانہ نہیں تھا۔ ۸۶ سال کی عمر میں شامو دادا نے یہ کمال کیا ہے کہ اُردو پڑھنی سیکھ لی ہے۔

شامو دادا میں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ گاؤں کے ہر اُس بوڑھے کی طرح ہے جو گرمیاں درختوں کی چھاؤں میں اور سردیاں دھوپ میں بیٹھ کر باتیں کرتے اور اپنی اولاد کے بچوں کو بہلاتے اور ان کے ساتھ کھیلتے گزارا کرتے ہیں۔ شامو دادا نے اپنے آپ میں ایک خاص بات پیدا کر لی ہے۔ وہ یہ کہ ڈیڑھ پونے دو سال سے وہ مجھ سے "حکایت" لے کر پڑھ رہا ہے۔ میری اور اس کی دوستی

"حکایت" سے پکی ہوتی ہے۔ اُس کی دلچسپی جرائم کی کہانیوں میں زیادہ ہے۔ وہ محترم احمد یار خان کی کہانیاں اور آپ کا مسلسل ناول "ہیرے کا جگر" اور پرانے زمانے کے ڈاکوؤں کی کہانیاں مگن ہو کر پڑھتا ہے۔ تین چار مہینوں سے وہ میرے ساتھ ان کہانیوں کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ ایک روز اُس نے مجھے گھر سے بلایا اور باہر لے جا کر ایک درخت کے نیچے بٹھا لیا۔

"اشرف بیٹا!" — اُس نے کہا — "تم اس تھانیدار کی کہانیاں پڑھتے ہو نا! یہ جو احمد یار خان ہے.... بہت لائق تھانیدار رہا ہے مگر میرے دل میں ایک بات آتی ہے۔ تھانیدار چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو پکڑ لیتے ہیں اور انہیں سزا دلا کر جیل خانے میں بھیج دیتے ہیں مگر قید کاٹ کر وہ باہر آتے ہیں تو پھر چوریاں کرنے لگتے ہیں.... میں یہ کہانی بھی پڑھ رہا ہوں جس کا نام 'ہیرے کا جگر' ہے۔ اس میں ایک جیدا جیب کترا ہے اور اُس کے بہت سارے ساتھی ہیں۔ ان کا پیشہ یہی ہے کہ لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں اور ڈاکے ڈالتے ہیں مگر باز نہیں آتے۔"

"پولیس ان کی مدد کرتی ہے" — میں نے کہا — "انہیں اگر سزا ملے تو سیدھے راستے پر آجائیں۔"

"نہیں آ سکتے" — شامو دادا نے کہا — "لوہے کی ہتھکڑیاں اور لوہے کی سلاخیں گنہگار کو نیک نہیں بنا سکتیں۔"

شامو دادا چپ ہو گیا اور کچھ اس طرح ہوا کو دیکھنے لگا جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو یا جیسے وہ کوئی خاص بات چھپا گیا ہو۔ اُس نے جو موضوع چھیڑ دیا تھا اس پر میں نے کچھ باتیں کیں۔ وہ سنتا رہا۔ آخر کار اُس کے سینے سے وہ بات نکل آئی جو اُس نے چھپائی تھی۔ یہ بات بہت لمبی ہے۔ اگر شامو دادا فلاسفر ہوتا، عالم فاضل ہوتا تو فلسفے، قرآن اور احادیث کے حوالوں سے جرم و سزا پر روشنی ڈالتا۔ اُس نے اپنی ۸۶ سالہ زندگی کی کہانی سنا دی ہے۔ جو میں اُس کی اجازت سے آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ میں اب درمیان میں سے نکل جاتا ہوں۔ شامو دادا اپنی کہانی خود سنا رہا ہے:

میں پچھلی صدی میں پیدا ہوا تھا۔ ہمارا گاؤں جالندھر سے بارہ تیرہ میل دور

تھا۔ بہت چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں سب کسان رہتے تھے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی باپ کے ساتھ کھیتی باڑی شروع کر دی۔ میرے بعد میری ایک بہن پیدا ہوئی۔ حکومت انگریزوں کی تھی۔ ہم دل سے انگریزوں کو بادشاہ سمجھا کرتے تھے۔ ہم سب غریب لوگ تھے۔ کبھی کسی نے نہیں کہا تھا کہ ہم انگریزوں سے آزادی حاصل کریں گے۔ ہم سمجھتے تھے کہ بادشاہ صرف انگریز ہوا کرتے ہیں اور ساری دُنیا کے بادشاہ انگریز ہیں۔ میں جب بڑوں سے انگریزوں کے متعلق باتیں سُنا کرتا تھا تو میں سمجھا کرتا تھا کہ انگریز آسمانوں سے اُترے ہوتے ہیں اور وہ زمین پر کسی قسمت والے کو نظر آتے ہیں۔ مجھے انگریز دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

میرا یہ شوق اٹھارہ سال بعد پورا ہوا۔ مجھے ۱۹۱۲ء کا سن اچھی طرح یاد ہے۔ اُس وقت میری بہن کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ ہمارے گاؤں میں ایک انگریز آیا۔ اُس کے ساتھ پولیس کے آدمی تھے اور دو سویلین بھی۔ گاؤں میں شور مچ گیا — "گورا صاحب آیا... گورا بادشاہ آیا"۔ گاؤں کا بچہ بچہ باہر نکل آیا۔ بوڑھوں نے ہمیں کہا کہ گورے صاحب کی طرف اُنگلی کا اشارہ نہ کرنا ورنہ پولیس کے حوالے کر دے گا۔

تھوڑی دیر بعد گورے صاحب نے اُنگلی میری طرف کر دی۔ صاحب کے ساتھ جو آدمی تھے ان میں سے دو تین اکٹھے بولے — "اِدھر آجا اوئے۔ اِدھر کھڑا ہو جا"۔ صاحب نے گاؤں کے دو اور مجھ جیسے جوانوں کو بھی الگ کر لیا۔ میرا جسم بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔ میں ڈر گیا کہ گورے صاحب نے ہمیں کیوں الگ کھڑا کر دیا ہے۔ اُس نے میرا ڈر جلدی رفع کر دیا۔ اُس نے اُردو زبان میں کہا کہ ہمیں فوج میں بھرتی کیا جا رہا ہے۔ صاحب گاؤں گاؤں گھوم پھر کر مجھ جیسے گٹھے ہوئے جسم والے نوجوانوں کو چن رہا تھا۔ ہم تینوں کو جالندھر پہنچنے کا حکم ملا۔ ہمارے والدین نے بہت خوشیاں منائیں۔ میں بہت خوش تھا۔

ہم جالندھر چلے گئے۔ وہاں ایک سے ایک خوبصورت اور چھ فُٹا جوان موجود تھا۔ ہمارا ڈاکٹری معائنہ ہوا اور ہمیں جھانسی بھیج دیا گیا۔ جھانسی ہندوستان میں دُور اندر ایک چھاؤنی ہے اور یہ رسالے کا ٹریننگ سنٹر تھا۔ اُس وقت رسالے

میں گھوڑے ہُوا کرتے تھے۔ ہماری ٹریننگ شروع ہو گئی۔ جب ٹریننگ ختم ہوئی تو میں شاہسوار بن چکا تھا۔

۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ یہ پہلی جنگِ عظیم تھی۔ اُس وقت ریڈیو نہیں ہُوا کرتا تھا۔ میں اَن پڑھ تھا، اس لئے اخباروں سے بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ اخبار آج کی طرح زیادہ بھی نہیں تھے۔ اب مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ کون سا واقعہ کون سے سَن میں ہُوا۔ میں صرف واقعات سُنا دیتا ہوں۔ میں پکّا سوار سپاہی بن چکا تھا۔ چھاؤنی میں ایک مسجد تھی۔ ہمارے رسالے کی بھی مسجد تھی اور سرکاری مولوی بھی تھا لیکن کبھی کبھی ہم جمعہ کی نماز چھاؤنی کی مسجد میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ جنگ کی خبریں زبانی زبانی ہم تک پہنچتی تھیں۔ ایک روز میں جمعہ پڑھنے چھاؤنی کی مسجد میں گیا تو امام صاحب نے وعظ میں کہا کہ تُرک پکّے مسلمان ہیں اور وہ انگریزوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تُرکوں کا ساتھ دیں کیونکہ مسلمان کسی مسلمان کے خلاف لڑے تو وہ کافر ہو کر مرتا ہے۔

امام صاحب کے وعظ نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ تُرک کیا ہیں۔ اس وعظ کے بعد رسالے میں جو مسلمان سوار تھے وہ چوری چوری تُرکوں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں یہ باتیں دلچسپی سے سُنا کرتا تھا۔ بعض مسلمان سوار شہر کی مسجدوں میں بھی جانے لگے۔ اُنہوں نے بتایا کہ ہر مسجد میں یہ وعظ ہوتے ہیں کہ تُرک ہمارے مسلمان بھائی ہیں اور ان کے خلاف جو مسلمان سپاہی لڑے گا وہ کافر ہو کر مرے گا۔ ہمیں معلوم تھا کہ انگریزوں نے ہندوستانی فوج کی بہت سی پلٹنیں اور رسالے یورپ اور عرب کے علاقوں میں بھیج دیئے ہیں اور مزید ہندوستانی فوج بھیجی جا رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سویلین مسلمانوں نے ایسا خفیہ انتظام کر دیا تھا کہ ہندوستان میں جو مسلمان فوجی ہیں، اُن کے کانوں میں تُرکوں کے حق میں اور انگریزوں کے خلاف باتیں پڑتی رہیں۔ ہمارے رسالے کے سوار چھُٹی لے کر گھروں کو جاتے تھے۔ وہ واپس آکر بتاتے تھے کہ ہر جگہ مسجدوں میں یہ وعظ ہوتے ہیں کہ انگریزوں کے حکم سے تُرکوں کے خلاف لڑنا کفر ہے۔

میں بھی اس دوران دس دِنوں کی چھُٹی لے کر گاؤں آیا تھا۔ ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں مسلمان تُرکوں کی باتیں کرتے تھے اور یہی کہتے تھے کہ مسلمان فوجیوں کو تُرکوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہیئے۔

میں انگریزوں کو آسمان سے اُتری ہوئی قوم سمجھا کرتا تھا۔ اب میرے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ بعض شہروں میں انگریزوں نے اماموں کو حکومتِ برطانیہ کے خلاف نفرت پھیلانے کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے۔ معلوم نہیں یہ خبریں کہاں تک سچ تھیں لیکن اس کا اثر مجھ پر یہ ہُوا کہ میں گورے کی صورت دیکھ کر دل میں جلنے لگتا تھا۔ میرے رسالے کے ہر مسلمان سوار کے دل کا حال میری طرح تھا۔ اب تو مسجدوں اور اماموں میں وہ بات ہی نہیں۔ اُن دنوں میں مسجد سے جو آواز اُٹھتی تھی اُسے خُدا اور رسولؐ کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ آج کوئی ایک مسجد مجھے دکھا دیں جہاں سے یہ آواز اُٹھتی ہو کہ ہندوستان ہمارا دُشمن ہے اور ہندوستان میں ہندوؤں نے ہمارے لاکھوں مسلمان بھائی اور اُن کے بچے قتل کر دیئے ہیں۔ جہاد کی آواز کسی مسجد سے نہیں سُنائی دیتی۔ میں جالندھر کے ضلعے کا مسلمان ہوں۔ مجھ سے پوچھو کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں اور سکھوں نے ہمارا کیا حال کیا اور ہم کس حال میں وہاں سے نکلے تھے۔

مسجدوں میں انگریزوں کے خلاف وعظ ہوتے رہے۔ ہر نماز کے بعد تُرکوں کی فتح کے لئے دعا کی جاتی تھی۔ جنگ کا شاید تیسرا سال تھا۔ ہماری چھُٹی بند ہو گئی تھی اور فوجیوں کے لئے لائنوں سے باہر جانا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ جنگ میں عموماً فوجیوں پر اس قسم کی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں لیکن تُرکوں کے حق میں جو وعظ ہو رہے تھے اور چوری چوری جو پروپیگنڈہ ہو رہا تھا وہ مسلمان فوجیوں پر اثر کر چکا تھا۔ اب ہمیں اس قسم کی خبریں ملنے لگیں کہ تُرک انگریزوں کا بُرا حال کر رہے ہیں۔ ہم یہ خبریں سُن کر بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک صبح ہمارے رسالے کو پریڈ گراؤنڈ میں 'فال اِن' کیا گیا۔ رسالے کے دو سکواڈرن مسلمانوں کے تھے اور دو ہندوؤں کے۔ پریڈ تو ہر روز ہوتی تھی

لیکن ہر سکواڈرن کا اپنا اپنا کام ہوتا تھا۔ اُس صبح تمام رسالے کو یکجا کیا گیا۔ ہمارا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ولکاکس تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار آ گیا۔ رسالے کے سامنے گھوڑا روک کر اُس نے حکم سنایا کہ رسالہ میسوپوٹیمیا جا رہا ہے۔ آج کل میسوپوٹیمیا کو عراق کہتے ہیں۔ فوج میں کمانڈنگ آفیسر حکم نہیں سنایا کرتے۔ سکواڈرن کمانڈروں کو حکم مل جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے سکواڈرن کو سنا دیتے ہیں مگر کمانڈنگ آفیسر نے خود حکم سنایا تو ہم سب کچھ حیران ہوتے۔

کرنل نے کہا کہ ہمارا رسالہ ترکوں کے خلاف لڑنے جا رہا ہے اور فتح ہماری ہو گی۔ میرے دل کو دھکا سا لگا۔ میرا خیال ہے کہ تمام مسلمان سواروں کا یہی حال ہوا ہو گا۔ ہم سب گھوڑوں پر سوار تھے۔ گھوڑے رینکس (صفوں) میں کھڑے تھے۔ گھوڑے میں یہ وصف ہوتا ہے کہ اس کی پیٹھ پر اس کا سوار بے چین ہو کر ذرا سی بھی جسمانی حرکت کرے تو گھوڑا بھی کچھ بے چینی کی حرکت کرتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسلمان سکواڈرنوں کے گھوڑوں نے حرکت کی تھی اور سواروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ ہمارا کرنل سمجھ گیا کہ مسلمان سوار ترکوں کے خلاف لڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اُس نے مسلمان سکواڈرنوں کو وہیں کھڑا رہنے کا حکم دیا اور ہندو سکواڈرنوں کو ڈسمس کر دیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہمارے سامنے آ رکا۔ انگریز افسر بڑی صاف اُردو بولا کرتے تھے۔ اُس نے جو لیکچر دیا وہ کچھ اس طرح تھا:

"ہم کو رپورٹیں ملی ہیں کہ مولوی لوگ مسلمان جوانوں کو مذہب کے نام پر غلط باتیں بتا رہے ہیں۔ یہ مولوی لوگ تمہارے دشمن کے دوست ہیں۔ ترک تمہارے دشمن ہیں۔ وہ تمہاری طرح پکے مسلمان نہیں ہیں۔ وہ صرف نام کے مسلمان ہیں۔ تم بہت بہادر سوار ہو۔ ترک تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم میں سے کوئی ایک بھی جوان اُن مسلمانوں کی بات نہیں مانے گا جو تم کو گمراہ کرتے ہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے کہ تم شہنشاہِ معظم برطانیہ کا حکم دلی خوشی سے بجا لاؤ گے۔ تم جب ترکوں کے مقابلے میں جاؤ گے تو فتح سے اپنا بھی سر اونچا کرو گے اور شہنشاہِ معظم کا بھی۔"

انگریز بڑی عقلمند قوم تھی۔ انگریز افسر چہروں سے جان لیتے تھے کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ میں اپنی بتاتا ہوں کہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کرنل کے سینے سے برچھی پار کر دوں جس نے ترکوں کو ہمارا دشمن کہا ہے۔ مجھے صاف پتہ چل رہا تھا کہ خون میرے چہرے پر چڑھ آیا ہے۔ دوسروں کا بھی یہی حال ہو گا۔ ہم بارکوں میں جو باتیں کیا کرتے تھے، ان سے میں اندازہ کر رہا تھا کہ کمانڈنگ آفیسر کی یہ باتیں کسی بھی سوار نے برداشت نہیں کیں۔ دونوں سکواڈرنوں کے سوار اور اُن کے گھوڑے اس طرح خاموش تھے جیسے وہاں نہ کوئی گھوڑا تھا نہ کوئی انسان۔

کرنل نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا کہ اُس کا لیکچر کسی بھی مسلمان سوار کو پسند نہیں آیا۔ وہ غصے میں آ گیا۔ اُس نے حکم دیا — "جو سوار ترکوں کے خلاف لڑنے پر راضی نہیں ہے وہ اپنا گھوڑا ایک قدم آگے لے آتے۔"

اللہ تیری شان! مومن کا جذبہ دیکھو کہ دونوں سکواڈرنوں کے گھوڑے ایک ہی وقت ایک قدم آگے ہو گئے جیسے سب سوار اور گھوڑے ایک ہی مشین کے کل پُرزے ہوں۔ انگریز کرنل کے منہ سے جھاگ پھوٹنے لگی۔ اُس نے بڑے ہی سخت غصے میں چلا کر کہا — "تم غدار مسلمان، بزدل ہو۔ تم لڑائی سے ڈرتے ہو اور مذہب کا بہانہ بنا کر لڑائی سے بھاگنا چاہتے ہو۔ میں دیکھوں گا کون بزدلی دکھاتا ہے۔"

کرنل کو تسلی ہو گئی ہو گی کہ سب سوار ڈر گئے ہیں۔ غلاموں میں اتنی جرأت کہاں کہ انگریز بادشاہ کے حکم کو نہ مانیں۔ اُس نے سکواڈرن ڈسمس کر دیئے۔ ہم گھوڑے اصطبل میں چھوڑ کر بارکوں میں چلے گئے۔ پہلے تو ہم سب خاموش تھے۔ بارک میں آ کر ایک سوار نے اونچی آواز میں کرنل کو گالیاں دیں۔ تین چار سواروں نے اُسے گالیاں دینی شروع کر دیں اور اُسے کہا کہ گالیاں دینا عورتوں کا کام ہے۔ کرنل نے ہمیں بزدل کہا ہے۔ ہم اُسے بتائیں گے کہ ہم بزدل نہیں ہیں۔

"کیا تم ترکوں کے خلاف لڑو گے؟" — گالیاں دینے والے نے پوچھا۔

"خاموش رہو" — ایک سوار نے اُسے کہا۔ "جو بات کرنی ہے ایک دوسرے کے کان میں کرو۔ شام کو پتہ چل جاتے گا۔"

شام تک پتہ چل گیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمارے سکواڈرنوں کے رسالدار بھی

مسلمان تھے۔ فوج میں یہ دستور رہا ہے کہ رسالوں کے رسالدار اور پلٹنوں کے صوبیدار (جنہیں فوج کی زبان میں سردار کہا جاتا تھا) انگریز افسروں کی اتنی زیادہ خوشامد کرتے تھے اور ایسے ایسے طریقوں سے کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو شرم آجاتی تھی۔ ہمارے رسالدار بھی خوشامد کرتے تھے لیکن اُس روز ان دونوں نے سامنے آئے بغیر ہمیں در پردہ بتادیا کہ کل صبح ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہ دیکھئے غیرت اور اتفاق کی برکت!

ہم نے چوری چوری جو پروگرام بنایا تھا اس کے مطابق ہم دوسری صبح اصطبل میں گئے مگر گھوڑوں کے پاس جانے کی بجائے ذرا الگ ہٹ کر ویسے ہی کھڑے ہوگئے جیسے پریڈ پر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ سکواڈرنوں کے دونوں رسالدار وہاں نہیں تھے۔ رسالداروں کا پریڈ پر ہونا لازمی تھا۔ جب سکواڈرن کمانڈر آتے تھے تو رسالدار انہیں سیلوٹ کرکے پریڈ اُن کے حوالے کیا کرتے تھے۔ یہ فوج کا بڑا سخت دستور ہے جس کی خلاف ورزی ایسا جرم ہے کہ کورٹ مارشل ہوتا ہے۔ رسالداروں کا غیر حاضر ہونا ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔

سکواڈرن کمانڈر انگریز تھے۔ ہمارا کمانڈر کیپٹن ایڈمنڈ اور دوسرے سکواڈرن کا کمانڈر لیفٹیننٹ میڈوسن تھا۔ اُنہوں نے رسالداروں کو غیر حاضر دیکھ کر بڑے غصے سے حکم دیا کہ سوار اپنے اپنے گھوڑے کے پاس چلے جائیں۔ کوئی ایک بھی سوار اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ مجھے یہاں تک ہی پتہ تھا کہ سکواڈرن کمانڈر جو بھی حکم دیں وہ نہیں ماننا۔ اس سے آگے مجھے معلوم نہیں تھا کہ کیا ہوگا۔

جب کوئی بھی سوار اپنی جگہ سے نہ ہلا تو کیپٹن ایڈمنڈ نے منہ سے تھوک اُڑاتے ہوئے کہا ”تم سؤر لوگ....“ وہ اس سے آگے بول نہ سکا کیونکہ اصطبل میں کہیں چھپے ہوئے دو سوار اُٹھے۔ اُن کے پاس رائفلیں تھیں۔ انہوں نے اکٹھے کیپٹن ایڈمنڈ پہ گولی چلائی اور اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ لیفٹیننٹ میڈوسن بہت پھرتیلا افسر تھا۔ وہ رائفلوں والے سواروں کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لیفٹیننٹ میڈوسن نے لمبی چھلانگ لگا کر ایک سوار کو اپنے بازوؤں میں کس لیا۔ دوسرے سوار نے اس انگریز کے سر پہ رائفل کا اتنی زور سے مارا کہ وہ گرا اور مر گیا۔

یہ تھے وہ انگریز بادشاہ جن سے ہم ڈرا کرتے تھے اور ہمیں کہا جاتا تھا کہ کسی گورے صاحب کی طرف انگلی کا اشارہ نہ کرنا ورنہ پولیس کے حوالے کر دیگا۔

مجھے بالکل علم نہیں کہ یہ دونوں سوار رائفلیں کہاں سے لائے تھے۔ رائفلیں کوتوں میں بند ہوتی تھیں اور ہماری روزمرہ پریڈ رائفلوں کے بغیر ہُوا کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کسی مسلمان عہدیدار یا سردار نے کوت کھول دیا تھا اور خاص خاص سواروں کو رائفلیں دی گئی تھیں۔ باقی سب سواروں کے پاس برچھیاں اور تلواریں تھیں۔

دوسرے انگریز افسروں کو پتہ چلا تو وہ مسلمان سکواڈرنوں پہ قابو پانے کے لئے ہندو سکواڈرن کے سواروں کو لے آئے۔ ان کے ساتھ کوئی انگریز افسر نہیں تھا۔ دو ہندو رسالدار تھے۔ وہ جونہی سامنے آئے مسلمان سواروں نے دونوں پر فائرنگ کرکے انہیں ختم کر دیا۔ ہندو سوار وہاں سے کھسک گئے۔ وہ دراصل ڈر کر بھاگے تھے لیکن بعد میں اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہمارے خلاف لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے اِن پر اعتبار نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے بعد مسلمان سواروں نے جو بغاوت کی، اس پر قابو پانے کے لئے ہندو سواروں نے انگریزوں کا ساتھ پوری وفاداری سے دیا تھا۔

کئی ایک مسلمان سواروں کے پاس رائفلیں تھیں۔ ہمیں کہا گیا کہ چھاؤنی سے نکل جاؤ اور انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگا دو اور جہاں کہیں انگریز افسر نظر آئے اُسے جان سے مار دو۔ میرے ساتھ میرے چار ساتھی تھے۔ ہم میں سے ایک کے پاس بھی رائفل نہیں تھی۔ تلواریں اور برچھیاں تھیں۔ ایک انگریز لیفٹیننٹ ہمارے سامنے آگیا۔ ہم نے تلواروں اور برچھیوں سے اُس کے جسم کا قیمہ کر دیا۔ چھاؤنی میں بعض سواروں نے ہندوؤں کے تین چار مکان جلائے مگر انگریزوں کے بنگلوں پر گورا اور ہندو فوج پہنچ گئی تھی۔ ہمارے چار سواروں نے کرنل ولکاکس کے بنگلے پہ حملہ کیا لیکن وہ بچ گیا۔ اُس کا اردلی اُسے بچاتے ہوئے مارا گیا تھا۔

دو سکواڈرنوں پہ قابو پانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چھاؤنی میں بہت فوج

تھی۔ دو دنوں بعد ہمارے ہر ایک سوار کو پکڑ لیا گیا۔ سب جانتے تھے کہ بغاوت کی سزا موت ہے۔ اس کے باوجود ہم سب نعرے لگا رہے تھے ــــ "ہم بزدل نہیں ہیں.... ہم ترکوں کے خلاف نہیں لڑیں گے.... مسلمان مسلمان کے خلاف نہیں لڑے گا۔"

ہمیں بارکوں میں رکھا گیا اور ہم پر گورا رسالے کا پہرہ کھڑا کر دیا گیا۔ ہمیں اپنے انجام کا علم تھا۔ ہم نعرے لگاتے رہتے تھے۔ سات آٹھ روز بعد ہمیں بتایا گیا کہ دونوں مسلمان سکواڈرنوں کے ہر ایک سوار، عہدیدار اور سردار کو سروس سے ڈسمس کر دیا گیا ہے۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہمارا کورٹ مارشل لازمی تھا۔ انگریز بادشاہ ہمیں بخشنے والا نہیں تھا لیکن ہمیں اپنے اپنے گھروں کے ریلوے پاس دے کر رخصت کر دیا گیا۔

میں گھر آیا تو میرا سر فخر سے اونچا تھا۔ میں بڑے فخر سے کہنے لگا کہ میں نے ترکوں کے حق میں انگریز بادشاہ کے خلاف بغاوت کی ہے۔ اس خبر نے مجھے بہت دکھ دیا کہ ترکوں کو شکست ہو گئی ہے۔ میرے گاؤں کے مسلمان روتے بھی تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ترکوں کی شکست کی وجہ کیا تھی۔ میرا سر پھر بھی فخر سے اونچا تھا کہ میں ترکوں کے خلاف نہیں لڑا۔ میرے باپ نے مجھے کہا کہ میں ہر کسی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف باتیں نہ کیا کروں۔ یہ جرم ہے میں باز نہ آیا۔

گھر آنے کے تقریباً ایک مہینہ بعد ایک کانسٹیبل ہمارے گھر آیا۔ کہنے لگا کہ مجھے تھانے بلایا گیا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اسے پوری بات کا پتہ نہیں۔ اسے اتنا ہی پتہ تھا کہ کوئی سرکاری چٹھی آئی تھی۔ میں تھانے چلا گیا۔ تھانہ چار میل دور تھا اور تھانیدار ایک شاہ صاحب تھا۔ میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ وہ خود تو مر چکا ہوگا، اس کی آل اولاد پاکستان میں ہے۔ اس نے مجھ سے نام اور ولدیت پوچھی، پھر میرا فوجی نمبر پوچھا۔ میں نے بتایا۔

"شام دین!" ــــ اس نے کہا ــــ "تم حکومت کے خلاف بغاوت میں شامل ہوتے تھے۔ اس جرم میں تمہیں فوج سے نکال دیا گیا ہے۔ اب تم مشتبہ شخص ہو۔ حکم آیا ہے کہ تم پر نظر رکھی جائے۔ مجھے پہلے ہی خبر مل چکی ہے کہ تم حکومت کے

خلاف باتیں کرتے رہتے ہو۔ تم غریب آدمی ہو شام دین! خاموشی سے کھیتی باڑی میں لگ جاؤ۔ تمہارے خلاف اگر کسی نے کوئی جھوٹی رپٹ بھی درج کرا دی تو میں تمہیں گرفتار کر لوں گا کیونکہ سرکار نے لکھا ہے کہ تم خطرناک آدمی ہو۔ سر نیچا کر کے زندگی گزارو۔"

اس نے مجھے دھمکیاں دیں اور مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ میں گاؤں گیا تو سب یہ معلوم کرنے کے لئے اکٹھے ہو گئے کہ مجھے تھانے کیوں بلایا گیا تھا۔ میں نے سب کو بتا دیا۔ سب نے مجھے کہا کہ میں اپنی زبان بند رکھا کروں۔ میرے ماں باپ نے مجھے کہا کہ میں ایسے ہو جاؤں جیسے مر گیا ہوں۔ باپ نے مجھے میری بہن کا واسطہ دیا اور کہا کہ انہیں اس لڑکی کی فکر لگی ہوتی ہے۔ اگر میں گرفتار ہو گیا تو میری بہن گھر میں بیٹھی رہے گی۔

مجھے اپنی بہن کی فکر اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ تھی۔ وہ سولہ سترہ سال کی ہو چکی تھی۔ خدا نے اسے خوبصورتی بہت دی تھی اور رنگ بھی اچھا دیا تھا۔ میں اس کی شادی بہت جلدی کرنے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے چار پانچ سال جو سروس کی تھی اس کی تنخواہ میں سے میں نے گھر بہت پیسے بھیجے تھے لیکن ابھی کچھ کمی تھی جو اگلی فصل سے پوری کرنی تھی۔ میں نے بٹائی پر بھی دو آدمیوں کی زمین لے لی تھی۔

"تین چار مہینے گزرے تو شاہ صاحب تھانیدار ہمارے گاؤں میں سے گزرا۔

وہ کہیں سے آ رہا تھا۔ میرا گھر راستے میں تھا۔ میں اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے تھانیدار کو سلام کیا تو اس نے گھوڑا روک لیا اور مجھ سے پوچھا ــــ "تم ہی تھے نا جسے میں نے تھانے بلایا تھا؟" ــــ میں نے کہا کہ میں ہی تھا۔ اس نے کہا ــــ "تمہاری کوئی شکایت نہیں ملی.... شاباش.... کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔ مارے جاؤ گے۔"

میری بہن کسی کام سے گئی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ہمارے گھر کے سامنے تھانیدار، نمبردار اور پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں اور ان کے سامنے میں کھڑا ہوں تو وہ میرے پاس آ گئی۔ وہ ڈر گئی تھی کہ پولیس مجھے گرفتار کرنے آئی ہے۔

اُس نے تھانیدار کو دیکھا اور مجھ سے پُوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں نے اُسے تسلی دے کر کہا کہ وہ اندر چلی جائے۔ میں نے دیکھا کہ تھانیدار میری بہن کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میں جوان تھا اور میں اس مسکراہٹ کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تھانیدار نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ میں نے اُسے بتایا کہ میری بہن ہے۔

"بہت اچھا شام دین!" — تھانیدار نے دوستی کے لہجے میں کہا — "کوئی فکر نہ کرو۔ تم پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

پہلے وہ تھانیداروں کی طرح رُعب سے بول رہا تھا مگر اب اس کے دل میں میری ہمدردی اور دوستی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ گھوڑے سے اُتر آیا اور مجھے الگ لے جا کر کہنے لگا — "میں تمہاری آمدنی کا ایک اور ذریعہ پیدا کر دوں گا۔ تم سیانے آدمی ہو۔ جوان ہو۔ چالاک اور ہوشیار ہو۔ کھیتی باڑی بھی کرو اور میں جو کام دوں گا وہ بھی کرو۔ بہت پیسے ملیں گے۔"

"کام کیا ہو گا؟" — میں نے پوچھا۔

"مخبری جانتے ہو کیا ہوتی ہے؟" — اُس نے کہا — "میں سکھا دُوں گا۔"

"ہاں شاہ جی!" — میں نے کہا — "میں جانتا ہوں مخبری کیا ہوتی ہے، لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں لوگوں کی چغلیاں نہیں کھا سکتا اور میں پولیس کا خوشامدی بھی نہیں بن سکتا۔"

"بیوقوف نہ بنو شام دین!" — اُس نے کہا — "آج کسی وقت تھانے میں آ جانا۔ بڑی موج کراؤں گا۔"

"اس کام کے لئے تھانے نہیں آؤں گا" — میں نے کہا — "اور کوئی حکم دیں گے تو دوڑ کر پہنچوں گا۔"

وہ مجھے منانے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں اُس کی نیت بھانپ گیا تھا۔ غریب آدمی کی بیٹی کو اتنا خوبصورت نہیں ہونا چاہیئے۔ تھانیدار کی بات نہ ماننے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جھانسی میں مسجدوں میں جو وعظ سُنتے تھے ان سے میرے دل میں کوئی چراغ روشن ہو گیا تھا۔ میں مخبری کو آمدنی کا ذریعہ

نہیں بنا سکتا تھا۔

تھانیدار مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا۔ میں نے سارے گاؤں کو سُنا دیا کہ تھانیدار نے مجھے کیا کہا تھا اور میں نے کیا جواب دیا ہے۔ ہمارا نمبردار ایک سکھ تھا۔ مُکھ سنگھ۔ وہ ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ شام کو میرے گھر آیا اور مجھے لعنت ملامت کرنے لگا کہ میں نے ایک تو آمدنی کا ذریعہ قبول نہیں کیا، دوسرے تھانیدار کو ناراض کر دیا ہے۔ میں نے اس سکھ کو کورا جواب دیا مگر وہ کہنے لگا، شامُو! تم غریب آدمی ہو۔ تھانیدار کی دشمنی تمہیں تباہ کر دے گی۔ معلوم نہیں شاہ صاحب تم پر کیوں مہربان ہو گئے ہیں۔ اِن کی بات مان جاؤ۔

"مجھے معلوم ہے وہ مجھ پر کیوں مہربان ہو گیا ہے" — میں نے کہا — "میں نے تو انگریز بادشاہ کے خلاف ہتھیار اُٹھا لیتے تھے۔"

کچھ دن گزرے تو میں نے ایک عورت کو دیکھا۔ وہ ہمارے گھر کبھی نہیں آئی تھی۔ اب وہ میری ماں کی اور میری بہن کی سہیلی بن گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے۔ اُس کے خاوند کو میں جانتا تھا۔ وہ سب کی طرح کسان ہی تھا لیکن اُس کے ٹھاٹھ کچھ اور ہی تھے۔ گاؤں کے لوگ اُس سے دبکتے تھے۔ وہ پولیس کا مخبر تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی بیوی بھی اُسی کی طرح کی تھی۔ میں نے اپنی ماں کو ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ اس عورت کے ساتھ اتنا گہرا دوستانہ نہ رکھو۔ اس سے پہلے ماں نے مجھے کہا کہ یہ عورت اچھی نیت سے نہیں آتی۔

میں زیادہ باتیں کیا بتاؤں۔ وہ تھانیدار کی بھیجی ہوئی تھی اور میری بہن کو پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ایک روز اس عورت سے کہا کہ وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے۔ اُس نے اپنے خاوند کو بتایا۔ خاوند کو پولیس کی شہ حاصل تھی۔ اُس نے میرے ساتھ رُعب سے بات کی اور بات یہ کی کہ میں نے اُس کی بیوی کی بے عزتی کی ہے۔ میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ اُس کی بیوی ایسی نیت سے ہمارے گھر آتی ہے جو کوئی غیرت مند بھائی برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس نے جب میری یہ بات بھی نہ سمجھی تو میں نے

اُسے کہا کہ اگر اُس نے میرے ساتھ کوئی اور بات کی تو میں اُسے چلنے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس شخص نے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے اس طرح مسکرا کر دیکھا جیسے میں بیوقوف آدمی ہوں یا بچّہ ہوں۔

تین چار روز بعد مجھے تھانے سے بلاوا آیا۔ میں گیا تو تھانیدار شاہ نے کہا — "شام دینا! میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا؟ .... تمہاری کھوپڑی میں کچھ نہیں پڑا۔ کیا تم ابھی تک نہیں سمجھے کہ تم سرکار برطانیہ کے مشتبہ ہو؟ میں حیران ہوں کہ تمہارا کورٹ مارشل کیوں نہیں ہُوا اور تمہیں گولی سے سزائے موت کیوں نہیں دی گئی؟"

"میرا کورٹ مارشل اس لئے نہیں کیا گیا کہ میں اکیلا باغی نہیں تھا" — میں نے کہا — "پورے دو سکواڈرن باغی ہو گئے تھے .... اور شاہ جی! تین سو آدمیوں کا کورٹ مارشل اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ سارے ملک کے مسلمان تحریک کی حمایت کر رہے ہیں۔ سرکار ڈر گئی تھی کہ تین سو آدمیوں کو سزائے موت دی تو سارے ملک میں بغاوت پھیل جائے گی۔"

"میرے ساتھ زیادہ بک بک مت کرو" — تھانیدار نے رعب سے کہا — "تم نے بدمعاشیاں شروع کر دی ہیں۔ میں تمہیں شک میں پکڑ لوں تو بھی سرکار کہے گی کہ اسے دس سال کے لئے جیل خانے میں ڈال دو .... تم انسان بنو گے یا نہیں؟"

میں نے اُسے کہا کہ وہ میری کوئی ایک بدمعاشی بتا دے۔ اس کے جواب میں اُس نے اپنے حوالدار کو بلا کر کہا کہ اسے حوالات میں بند کر دو۔ میں نے شور شرابا کیا لیکن حوالدار مجھے گھسیٹ کر حوالات تک لے گیا۔ تھانیدار نے آواز دی — "اِدھر لاؤ اسے" — مجھے حوالدار اُس کے سامنے لے گیا۔ تھانیدار نے کہا — "میں تم پر رحم کرتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں قانون کی طاقت ہے"

میں نے پھر بھی کہا کہ شاہ جی، مجھے میرا قصور تو بتا دیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے میرے ساتھ دوستی کے لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔

اُس نے کہا کہ تمہیں اُس عورت کو اپنی ماں اور بہن سے ملنے سے نہیں روکنا چاہیئے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اچھی شہرت کی عورت نہیں، لیکن تھانیدار نے میرے ساتھ ایسی باتیں کیں جیسے وہ مجھ جیسے بے وسیلے اور غریب کسانوں کا "خدا" ہو۔

میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی نظر میری بہن پر ہے۔ میرے ہونٹوں تک آ گئی کہ میں اُسے صاف کہہ دوں کہ میں نے تُرک نہیں دیکھے لیکن اُن کی عزّت کی خاطر یہ جانتے ہوئے کہ مجھے سزائے موت ملے گی، میں نے بغاوت کی اور مسلمان سواروں کا پُورا ساتھ دیا۔ میں اپنی بہن کی عزّت ایک تھانیدار سے ڈر کر اُس کے حوالے نہیں کروں گا مگر مجھے ایسی بات کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ میں تھانے میں بیٹھا تھا جہاں مجھے کسی بھی بہانے سے حوالات میں بند کیا جا سکتا تھا۔ اُس زمانے میں تھانیدار اور نمبردار بادشاہ ہُوا کرتے تھے۔ انگریز افسر انہی کی رپورٹوں کو سچ مانتے تھے۔ لوگ ان کے آگے سجدے کرتے تھے۔

اُس نے مجھے گھر جانے کی اجازت تو دے دی لیکن میرے دل پہ یہ ڈر سوار رہا کہ یہ شخص مجھے پریشان کرتا رہے گا۔ میں غریب اور بے آسرا آدمی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میرے ماں باپ میری شادی کی باتیں کرتے تھے۔ قریب کے ایک گاؤں سے رشتہ مل گیا۔ میری شادی سے زیادہ بہن کی شادی زیادہ ضروری تھی۔ اللہ نے کرم کیا کہ بہن کے لئے بھی اچھے گھر کا رشتہ مل گیا۔ دونوں بہن بھائی شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ابھی دن مقرر نہیں ہوتے تھے۔

میرا ایک دوست عبدالقدیر تھا۔ اُس کا گاؤں میرے گاؤں سے آٹھ نو میل دُور تھا۔ وہ میرے ساتھ رسالے میں دوسرے سکواڈرن میں تھا۔ وہ سروس میں چرس بھی پیتا تھا اور جوا بھی کھیلا کرتا تھا۔ آدمی بدمعاش تھا لیکن دوستی کے قابل تھا۔ میرے ساتھ اُس کی گہری دوستی تھی۔ وہ دوستوں پر جان قربان کرنے والا آدمی تھا۔ سروس سے نکل کر میں اُس سے نہیں ملا

تھا۔ اب اس تھانیدار نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تو میں عبدالقدیر کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ تھانیدار میرے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ اس کی نظر میری بہن پر ہے۔

عبدالقدیر میری طرح دیہاتی اور اَن پڑھ تھا لیکن غیرت پر مر مٹنے والا تھا۔ اُس زمانے میں تعلیم نہیں تھی لیکن غیرت اور قربانی کا جذبہ بہت تھا۔ دوستوں میں وفا اور خلوص تھا۔ میری بات سُن کر عبدالقدیر کی آنکھیں لال سُرخ ہو گئیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے بھی سردس سے گھر آنے کے بعد تھانے بلایا گیا تھا۔ تھانیدار نے اُسے کہا تھا کہ وہ گاؤں میں کوئی گڑبڑ نہ کرے۔ اس کے بعد اتنا عرصہ گزر گیا تھا، اُسے تھانے نہیں بلایا گیا تھا۔

"غم نہ کرو شاہ مُو!"— اُس نے مجھے کہا— "میں تھانیدار کی نیت سمجھ گیا ہوں۔ اُس نے تمہیں زیادہ پریشان کیا تو میرے پاس آجانا، پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔"

اُس نے مجھے بہت تسلی دی اور میں اپنے گاؤں آگیا۔

ایک روز ہمارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چھ میل دُور کے ایک گاؤں میں ایک ہندو کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ خبر سنانے والے نے یہ بھی کہا کہ یہ جبّو کی واردات ہے۔ جبّو ہمارے علاقے کا ڈکیت تھا۔ وہ پکڑا نہیں جاتا تھا۔ ہمارے لئے یہ خبر بڑی دلچسپ تھی۔ دن بھر گاؤں والے اس ڈکیتی کی اور جبّو کی باتیں کرتے رہے۔ لوگ عجیب عجیب افواہیں اُڑاتے تھے۔ جس گاؤں میں ڈاکہ پڑا تھا وہ شاہ صاحب کے تھانے کا گاؤں تھا۔

دو روز بعد کا واقعہ ہے کہ ابھی سورج طلوع نہیں ہُوا تھا کہ تھانیدار آواز دیئے یا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر ہمارے گھر میں آگیا۔ اُس کے ساتھ پولیس کے تین سپاہی تھے۔ تھانیدار نے انہیں کہا کہ گھر کی تلاشی لو۔ سپاہی اس طرح میرے گھر پر ٹوٹ پڑے جیسے لُوٹ مار کر رہے ہوں۔ میرے گھر میں تھا ہی کیا۔ ایک کمرہ تھا اور اس کے ساتھ ایک کوٹھڑی اور ایک چھپر سا الگ ڈال رکھا تھا جس کے نیچے رات کو مویشی باندھا کرتے تھے۔ سامان اتنا ہی تھا کہ ایک

ٹرنک تھا اور زنگ لگا ہُوا ٹین کا ایک پُرانا سوٹ کیس۔ ڈولیاں اور گھڑے تھے۔

مجھے تھانیدار باہر لے گیا اور ایک آدمی سے کہا کہ وہ میرا کھُرا دیکھے۔ اُس نے مجھے پرے ہٹا کر زمین پر میرے پاؤں کا نشان دیکھا اور کہنے لگا— "ہاں شاہ جی! ایک کھُرا تو مِل گیا ہے.... یہی ہے۔"

تھانیدار نے مجھے بڑی ننگی گالی دے کر میرا بازو پکڑا اور مجھے گھسیٹ کر ایک طرف کرتے ہوئے کہا— "چل اوئے اِدھر.... ابھی مال برآمد کرتا ہوں۔"

میرے دل سے پولیس کا ڈر اور خوف نکل گیا لیکن میں خاموش رہا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ تھانیدار اِردگرد کھڑے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ یہ ڈاکوؤں کا ساتھی ہے۔ اس کا کھُرا موقعۂ واردات پر دیکھا گیا ہے اور کھُرا اس کے گھر تک آیا ہے۔

"سارا گاؤں گواہ ہے کہ میں گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا"— میں نے للکار کر کہا— "میرے گھر کی تلاشی لے لو۔"

تھانیدار نے مجھے اور زیادہ گالیاں دیں۔ میرے گھر کی تلاشی ہوئی تو کچھ بھی برآمد نہ ہُوا۔ مجھے تھانیدار اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ میری ماں اور میری بہن روتی چیختی رہ گئیں۔ تھانے لے جا کر تھانیدار نے مجھے برآمدے میں بٹھا دیا اور خود اندر چلا گیا۔ میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد تھانیدار شاید اپنے گھر چلا گیا۔ اُس کی گھوڑی بڑی اچھی نسل کی تھی۔ وہ برآمدے کے ساتھ ہی ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ اس پر زین کسی ہوئی تھی۔ گھوڑی درخت کے ساتھ اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ اس کی باگ درخت کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ باگ کو ویسے ہی ایک گانٹھ دی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر میں یہاں سے دوڑوں تو گھوڑی تک فاصلہ بارہ قدم بھی نہیں۔ باگ کھول کر گھوڑی پر سوار ہو جاؤں تو کیا میں بھاگ سکتا ہوں؟

پھر سوچا کہ میں جاؤں گا کہاں؟ سوچتے سوچتے اپنا جگری دوست عبدالقدیر یاد آگیا۔ میں نے بہت سوچا اور مجھے اپنی بہن کا خیال آگیا۔ اگر میں بھاگ جاتا تو

تھانیدار کو بڑا اچھا بہانہ مل جاتا کہ وہ میری بہن اور میرے ماں باپ کو بار بار تھانے بلاتا اور جب چاہتا میرے گھر پر جا چھاپہ مارتا۔ اس صورت میں میری بہن اس سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے فرار کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں بزدلی کی وجہ سے نہیں بھاگ رہا تھا۔ میں تھانیدار کو جتانا چاہتا تھا کہ میں اُس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ غریب آدمی کے ساتھ بے انصافی ہو تو اُس کی فریاد سُننے والا کوئی نہیں۔

برآمدے میں بیٹھے بیٹھے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ تھانیدار آگیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک سپاہی کے ساتھ میری ماں، میری بہن اور میرا باپ آرہے تھے۔ اگر سپاہی ان کے ساتھ نہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ میرے ماں باپ مجھے دیکھنے آئے ہیں۔ سپاہیوں کے کمرے سے ایک مسلمان سپاہی باہر نکلا۔ اُس نے میرے قریب کھڑے ہو کر تھانیدار شاہ کو گالی دے کر کہا — ”اللہ شاہ کو دُنیا میں سزا دے گا۔ غریبوں کو تنگ کر رہا ہے۔“

اُس نے یہ بات بڑی دھیمی آواز میں کہی تھی۔ وہ میرے پاس کھڑا رہا۔

اُس نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے پُوچھا — ”اوئے! تم واقعی ڈکیتی میں شامل تھے؟“

میرے آنسو نکل آئے۔ میرے منہ سے اتنا ہی نکلا — ”اللہ گواہ ہے“ — اور میں نے سر ہلایا کہ نہیں۔

سپاہی آگے چلا گیا لیکن اُس نے شاہ صاحب کو جو گالیاں دی تھیں ان سے میرا حوصلہ بڑھ گیا، پھر میرا حوصلہ اپنی بہن کو خطرے میں دیکھ کر بڑھا۔ سپاہی جو میرے ماں باپ اور بہن کو لایا تھا وہ انہیں باہر کھڑا کر کے تھانیدار کے کمرے میں چلا گیا۔ میری ماں اور بہن کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے نہ دیکھا کہ مجھے کوئی پکڑے گا، یا مجھ پر کوئی گولی چلا دے گا، یا میں جو کرنے لگا ہوں وہ میں نہیں کر سکوں گا، میں بجلی چمکنے کی طرح اُٹھا اور تھانیدار کی گھوڑی کی طرف دوڑا۔ میری بہن گھوڑی سے تین چار قدم دُور کھڑی تھی۔ میری ماں اور میرا باپ اُس کے پاس کھڑے تھے۔ ان تینوں نے مجھے دیکھا۔ میں نے بہن کی کمر میں ہاتھ ڈالے

اور اُسے اٹھا کر کہا کہ گھوڑی پر آجاؤ، گھبرانا نہیں۔

کوئی اور آدمی شاید اتنی پھرتی نہ کر سکتا جتنی میں نے کی۔ میں فوج کا سوار تھا۔ مجھے فوجی ٹریننگ ملی تھی۔ گھوڑ سواری میں مجھے مہارت حاصل تھی۔ میری بہن نے بھی کمال کر دکھایا۔ میں نے اُسے اٹھاتے ہوئے گھوڑی کے قریب کیا تو وہ گھوڑی پر فوراً سوار ہو گئی۔ میں نے باگ کو جھٹکا دیا تو باگ درخت سے کُھل گئی۔ میں نے رکاب میں پاؤں رکھا، گھوڑی کے پہلو میں گھونسہ مارا۔ گھوڑی اچھی نسل کی تھی، دَوڑ پڑی اور میں ٹانگ گھما کر اس پر سوار ہو گیا۔ مجھے تھانے میں شور سنائی دیا — ”وہ گیا۔۔۔ اوئے واپس آ۔۔۔ روکو۔۔۔ پکڑو“ — لیکن میں تھانے کے احاطے سے نکل گیا۔ بہن کو میں نے اپنے آگے ایک بازو میں لپیٹ رکھا تھا۔

اُس زمانے میں موٹر کاریں، موٹر سائیکل اور ہیلی کاپٹر نہیں تھے کہ مجھے پکڑ لیتے۔ وہ گھوڑوں کا زمانہ تھا۔ میرے پیچھے آنے والوں کو پہلے اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈالنی تھیں۔ تھانہ ایک بڑے گاؤں میں تھا۔ میں گاؤں میں سے نکل گیا۔ علاقہ میدانی تھا اس لئے میں چھُپ کر نہیں بھاگ سکتا تھا۔ اُس زمانے میں ویرانے اور جنگل زیادہ تھے، لیکن ابھی دُور تھے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی کو آگے بٹھاتے ہوئے ایک سوار گھوڑی سرپٹ دوڑاتا جا رہا تھا۔ لوگ اُسے رُک کر دیکھتے تھے۔

میں نے پیچھے دیکھا۔ گاؤں دُور رہ گیا تھا اور مجھے کوئی گھوڑا اپنی طرف آتا نظر نہیں آرہا تھا۔ آگے نشیبی علاقہ آگیا۔ کھڈ نالے بھی آگئے۔ ان میں داخل ہو کر میں نے عبدالقدیر کے گاؤں کا رُخ کر لیا اور گھوڑی کی رفتار ذرا کم کر دی تاکہ بالکل ہی رہ نہ جائے۔ میں اب غیر آباد علاقے میں جا رہا تھا۔

عبدالقدیر کے گاؤں سے کوئی ایک میل دُور گہرائی میں ایک برساتی نالہ تھا۔ میں نے وہاں گھوڑی روک لی۔ بہن کو اُتارا اور خود بھی اُتر گیا۔ گھوڑی کو گاؤں میں لے جانا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے گھوڑی کو پتھر مارا تو وہ دَوڑ پڑی۔ میں تھوڑی دُور اُس کے پیچھے گیا اور اُسے پتھر مارتا رہا۔ گھوڑی تیز دوڑ پڑی۔ گھوڑوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ انہیں اس طرح چھوڑ دو تو اپنے مالک کے

گھر پہنچ جاتے ہیں۔

میں بہن کو ساتھ لے کر عبدالقدیر کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ دن کے وقت بہن کو گاؤں میں لے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جوان لڑکی ہونے کی وجہ سے عورتیں اُسے غور سے دیکھتیں اور مرد بھی دیکھتے۔ خطرہ یہ تھا کہ پولیس ہماری تلاش میں اس گاؤں میں آجاتی تو لوگ بتا دیتے کہ عبدالقدیر کے گھر ایک جوان اور خوبصورت لڑکی آئی ہے۔ میں نے بہن کو ایک ایسی جگہ بٹھا دیا جہاں سے کسی کے گزرنے کا ڈر نہیں تھا۔ میں بہت تیز چلتا عبدالقدیر کے گھر گیا اور اُسے بتایا کہ میں بہن کو لے کر آگیا ہوں۔ اُسے سارا واقعہ سُنا دیا۔ اُس نے کہا کہ بہن کو ہم رات کو گھر لائیں گے۔ عبدالقدیر میرے ساتھ چل پڑا اور ہم اُس جگہ پہنچے جہاں بہن بیٹھی ہوئی تھی۔ عبدالقدیر نے شام تک وہیں بیٹھے رہنے کو کہا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

میری بہن نے بتایا کہ پولیس کا سپاہی ہمارے گھر گیا تو نمبردار بھی اُس کے ساتھ تھا۔ میری بہن اور ماں باپ سے نمبردار نے کہا کہ میں نے اقبالِ جرم کر لیا ہے لیکن شاہ صاحب (تھانیدار) مجھے بچا سکتا ہے۔ نمبردار نے میرے ماں باپ سے کہا کہ انہیں شاہ صاحب نے تھانے بلایا ہے۔ اس نے میری بہن کو الگ کر کے کہا کہ شاہ صاحب بہت اچھے آدمی ہیں اور دل کے سخی ہیں۔ اگر وہ کوئی ایسی ویسی بات کہہ بیٹھیں تو انہیں ناراض نہ کرنا۔ تھانے جاتے ہوئے راستے میں بھی سپاہی نے میری بہن سے یہی بات کہی تھی۔

میرا اندیشہ صحیح نکلا۔ تھانیدار نے بڑی بُری نیت سے مجھے پھانسا تھا اور میری بہن کو اسی نیت سے تھانے بُلایا تھا۔

شام گہری ہوگئی تو عبدالقدیر ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے کہا کہ وہ میری بہن کی عزت پر جان قربان کر دے گا اور میرے چھپنے کا انتظام کر دے گا لیکن اُس نے کہا میں کب تک چھپا رہوں گا۔ میں نے تھانے سے فرار ہو کر اپنے خلاف یہ شہادت پیدا کر دی تھی کہ میں واقعی ڈکیتی میں شامل تھا ۔۔۔ میں اب اشتہاری ملزم تھا۔

دلیری کے ساتھ عقل مندی بڑی ضروری ہے۔ بعض اوقات انسان ایسی دلیری کر بیٹھتا ہے جس کا نتیجہ اُسے مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔ ایسے ہی میرے ساتھ ہُوا۔ اشرف بیٹا! تم اگر غیرت والے ہو تو یہ سمجھ گئے ہو گے کہ میں نے اپنی بہن کو تھانے میں سے اُٹھا کر تھانیدار کی گھوڑی پر پھینکا اور خود بھی اسی گھوڑی پر سوار ہو کر فرار ہوگیا تو میں نے یہ دلیری اپنی بہن کی عزت اس تھانیدار سے بچانے کے لئے کی تھی۔ اگر میں عقل سے سوچنے بیٹھ جاتا کہ میں بہن کو ساتھ لے کر تھانے سے فرار ہوں گا تو اس کا آئندہ کیا نتیجہ ہوگا تو میں کچھ بھی نہ کرتا۔ اپنی کنواری بہن کو تھانیدار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔

میں بہت خوش تھا کہ میں نے بہت بڑا کارنامہ کیا ہے، اور یہ کارنامہ مجھے کرنا ہی چاہیئے تھا مگر میرے دوست عبدالقدیر نے مجھے اور میری بہن کو اپنے گھر میں پناہ دے کر کہا کہ اب یہ سوچو کہ کب تک چھپے رہو گے اور بہن کو کب تک چھپاؤ گے تو مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے عبدالقدیر کے مکان کی چھت میرے اُوپر آ پڑی ہو۔

"تم بے گناہ ہو شامُو!" — اُس نے کہا — "تم قسم کھاؤ نہ کھاؤ، میں تمہاری جگہ ساری دنیا کے سامنے للکار کر کہہ سکتا ہوں کہ اللہ گواہ ہے شامُو بے گناہ ہے، لیکن میرے دوست! تم نے ایک تھانیدار سے ٹکر لی ہے۔ وہ تو لکھ چکا ہوگا کہ شامُو تھانے کی گھوڑی پر تھانے سے بھاگ گیا ہے اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شامُو ڈکیتی میں شامل تھا۔ اب وہ شاہ صاحب تھانیدار سچا ہوگیا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اُس کی بُری نظر تمہاری بہن پر ہے لیکن تمہارا فرار تمہیں ڈکیت بنا رہا ہے۔"

"اگر تم ساتھ دو تو میں ڈکیت بن کر بھی دکھا دوں گا قادے!" میں نے کہا۔ ہم اُسے سروس میں قادا کہا کرتے تھے۔ میں نے کہا — "تم نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ میں اب گھر نہیں جا سکتا۔ جاؤں گا تو پکڑا جاؤں گا۔"

"اور اگر تم کوٹھے پر کھڑے ہو کر پورے زور کی آواز سے چلاؤ گے کہ تم

بیگناہ ہوا اور شاہ صاحب نے تمہیں تمہاری بہن پر نظر رکھ کر مشتبہ بٹھایا تھا تو بھی تمہاری مدد کو کوئی نہیں آئے گا"۔ قادے نے کہا۔۔۔ "تھانیدار علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ تمہیں اب کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔ وہ تمہارے ماں باپ کو پریشان کر رہا ہوگا۔ تمہیں اب ڈھونڈا جائے گا۔"

میں تھا تو دلیر لیکن عبدالقدیر کی ان باتوں نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "بھائی قادے! تم مجھے ڈرا کیوں رہے ہو؟ صاف کہہ دو کہ تم مجھے اور میری بہن کو اپنے گھر رکھنے سے ڈرتے ہو۔ کیا تم مجھے یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اپنے گاؤں چلا جاؤں؟"

اُس نے مجھے گالی دے کر کہا۔۔۔ "تم نے مجھے بزدل سمجھ لیا ہے۔ میں تمہاری دوستی پر اور تمہاری بہن کی عزت پر اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔ تمہاری بہن اب میری بہن ہے کیونکہ یہ میری پناہ میں ہے۔ میں نے تمہیں اس لئے ڈرایا ہے کہ تم نے خود کہا ہے کہ تم ڈکیت بن کر دکھاؤ گے۔ میں تمہیں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ تمہارے لئے اب دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے ماں باپ کو چوری چھپے وہاں سے نکالو اور انہیں اور اپنی بہن کو ساتھ لے کر کہیں اتنی دُور چلے جاؤ جہاں شاہ تھانیدار کا ہاتھ نہ پہنچ سکے مگر یہ تمہارے لئے ممکن نہیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ چھُپ چھُپ کر ہی زندہ رہنا ہے تو جبّو ڈاکو کی طرح زندہ رہو تاکہ لوگ یاد کرتے رہیں کہ کوئی شامو ڈاکو بھی ہو گزرا ہے۔"

"تم ساتھ دو گے؟"

"ہاں"۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا۔۔۔ "میں ساتھ دوں گا لیکن یہ صرف دو آدمیوں کا کام نہیں۔ تین چار اور آدمی مل جائیں تو ٹولہ پورا ہو سکتا ہے۔"

میرے اور اُس کے درمیان بہت باتیں ہوئیں۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ عبدالقدیر سروس میں چرس پیتا اور جؤا کھیلتا تھا اور وہ بدمعاشی بھی کرتا تھا۔ گاؤں میں بھی اُس کا رُعب اور دبدبہ تھا۔ اُس کی اپنی زمین تھی جو اُس نے بٹائی پر دے رکھی تھی مگر اُس نے خود ہی بتایا کہ وہ چرس اور جُوئے کا عادی ہے اور اُس کا یارانہ دو تین ایسے آدمیوں سے ہے جو چوری

چکاری کرتے ہیں اور مویشی بھی چوری کر کے دُور و دراز علاقوں میں پہنچا دیا کرتے ہیں۔ اس قماش کا آدمی ہونے کے باوجود عبدالقدیر نے جھانسی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت میں پورا حصّہ لیا تھا۔

عبدالقدیر کے ساتھ اتنی لمبی چوڑی باتوں کے دوران پتہ چلا کہ جبّو ڈاکو کے ساتھ بھی اُس کی میل ملاقات ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اُس کے اپنے دل میں پہلے سے ارادہ تھا کہ اُسے تجربہ کار اور قابلِ اعتبار ساتھی مِل جائیں تو وہ جبّو سے بڑھ کر ڈکیت بنے گا۔ یہی بات میرے منہ سے نکل گئی تھی کہ مجھ پر ڈکیتی کا شک کیا گیا ہے تو میں ڈکیت بن کر دکھاؤں گا۔ عبدالقدیر نے مجھے پکا کرنا شروع کر دیا کہ میں ڈکیت بن کر ہی دکھاؤں اور وہ ساتھ دے گا۔

ہم نے سکیم بنانی شروع کر دی۔ میں نے تو کبھی معمولی سا بھی جرم نہیں کیا تھا نہ کبھی سوچا تھا کہ مجرم بن کر عیش کی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ عبدالقدیر نے کبھی چوری چکاری نہیں کی تھی۔ وہ اب بھی کہتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی چوریاں نہیں کریں گے بلکہ جبّو سے بڑے ڈاکو بنیں گے اور ہندو ساہوکاروں اور جاگیرداروں کو للکار کر لوٹیں گے۔ عبدالقدیر نے جبّو کے ساتھ میل ملاقات کر کے اُس سے بہت کچھ معلوم کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ دو تین عادی مجرموں کے ساتھ اُس کا یارانہ تھا۔ پولیس کے دو چار کانسٹیبلوں کے ساتھ بھی اُس کی دوستی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ یہ پولیس میں رہیں گے اور ہماری مدد کریں گے۔ مختصر یہ کہ وہ نامی گرامی ڈاکو بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ شادی شدہ تھا۔ تین سال ہونے کو آتے تھے، کوئی بچہ نہیں ہوا تھا۔ اُس کی بیوی اُسی کی طرح نہ صرف ہنس مکھ اور خوبصورت تھی، بلکہ شوخ، چالاک اور ہوشیار بھی تھی۔ میاں بیوی کو آپس میں دلی محبت تھی۔ عبدالقدیر تھا ہی محبت کے قابل۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کی بیوی اُسے ڈاکو بننے دے گی؟ اُس نے بتایا کہ وہ صرف اجازت ہی نہیں دے گی بلکہ اُس کا ساتھ بھی دے گی۔ میں حیران ہوا کہ خاندانی عورت خاوند کو ڈاکو بننے میں مدد دے گی۔ تب عبدالقدیر

نے مجھے بتایا کہ اس عورت کے لئے وہ بارات لے کر نہیں گیا تھا، نہ اُسے ڈولی میں لایا تھا بلکہ یہ اُس کے پیچھے گھر سے نکل آئی تھی۔ اس سے تم سمجھ لو کہ وہ عورت دل گردے والی تھی۔ عورت نہیں، وہ جوان لڑکی تھی۔ اُس وقت عبدالقدیر سروس میں تھا۔ ایک مہینے کی چھٹی آیا تو اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

عبدالقدیر نے مجھے بتایا کہ چاہے اُس کی بیوی کو ساری عمر بچہ نہ ہو، وہ اولاد کے لئے دوسری شادی نہیں کرے گا۔ اس کی بیوی نے میری بہن کو گلے لگا لیا اور مجھے بھی تسلیاں دی تھیں۔ عبدالقدیر پر مجھے پورا بھروسہ تھا۔

اشرف بیٹا! میں تمہیں ایک بات پہلے ہی بتا دوں۔ میں کسی اور وقت کی بات آج کے وقت سُنا رہا ہوں۔ ساٹھ سال سے اُوپر مدّت گزر گئی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ خلوص اور محبّت کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے اور آج کے وقت میں سیاہ اور سفید جتنا فرق ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں ڈاکوؤں کی کوئی ایسی کہانی نہیں سناؤں گا جیسی تم پڑھتے رہتے ہو۔ کہانی کا تعلق تو ڈاکوؤں کے ساتھ ہی ہے لیکن یہ بات کچھ اور ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اُس وقت کے ڈاکو، ٹھگ اور رہزن عجب انسان ہوتے تھے۔ انہیں پولیس کی کوئی مدد حاصل نہیں ہوتی تھی جیسے آج کل ہوتی ہے۔ آج کل تو شہروں اور قصبوں میں دُبلے پتلے، مریض سے چور اور گرہ کٹ ہوتے ہیں جو پولیس کی دلیری پر وارداتیں کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں پولیس اور ڈاکوؤں کی دشمنی ہوتی تھی۔ انگریز اُس پولیس آفیسر کو بہت انعام اور ترقی دیتے تھے جو کسی ڈاکو یا کسی نقب لگانے والے کو پکڑ لے۔ ان میں زیادہ مجرم ایسے ہوتے تھے جو بہت مالدار گھروں پر ہاتھ ڈالتے تھے۔ معمولی لوگوں کے ساتھ اُن کے بڑے اچھے تعلقات ہوتے تھے۔ ان میں جو مشہور اور جابر تھے وہ غریب دیہاتیوں کو مالی امداد بھی دیا کرتے تھے۔ اس کے صلے میں دیہاتی انہیں اپنے ہاں چھپا لیتے تھے اور پولیس کو گمراہ بھی کرتے تھے۔ عبدالقدیر اسی قسم کا ڈاکو بننا چاہتا تھا۔ جبتو بھی ایسا ہی ڈاکو تھا لیکن

کبھی کبھی غریب آدمی کو بھی پریشان کر جاتا تھا۔ تم کہو گے کہ شامو دادا، تم نے کوئی اچھی بات تو نہیں سوچی تھی۔ تم تھانے حاضر ہو جاتے تو مقدمہ لڑتے۔ اگر تم ایسا کہو گے تو میں تمہیں یہی کہوں گا کہ تھانیدار نے میرے ساتھ جو سلوک کیا اُس پر غور کرو اور سمجھو کہ میری جگہ تم ہو۔ میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔

ہم دونوں نے ڈاکو بننے کی سکیم تیار کر لی۔ عبدالقدیر کہتا تھا کہ اپنے گروہ میں تجربہ کار آدمیوں کو شامل کرتے جائیں گے اور پھر ریل گاڑیاں لُوٹا کریں گے۔ میں نے عبدالقدیر سے کہا کہ یہ بہت بعد کا معاملہ ہے کہ ہم ریل گاڑیاں لُوٹنے کے قابل ہو سکیں گے یا نہیں۔ سب سے پہلے شاہ صاحب تھانیدار کے گھر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ شاہ جالندھر سے چند میل دُور کے ایک قصبے کا رہنے والا تھا۔ اس سے پہلے ایک مسئلہ اور تھا۔ یہ میرے ماں باپ کا مسئلہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاہ صاحب انہیں پریشان کر رہا ہو گا۔

میں نے عبدالقدیر سے کہا کہ میں اپنے ماں باپ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ عبدالقدیر نے کہا کہ یہ کام وہ کرے گا اور وہ تھانے سے یہ بھی معلوم کرے گا کہ تھانیدار کیا کر رہا ہے۔ اُس تھانے میں ایک کانسٹیبل اُس کا دوست تھا۔ میری بہن کے متعلق اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ کوئی پُوچھے تو بتانا کہ اُس کی خالہ زاد بہن ہے۔ اس کے گاؤں میں اس کے ماں باپ کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو گئی ہے اور اس لڑکی کے اغوا کا خطرہ ہے اس لئے یہ کچھ عرصہ یہیں رہے گی۔

اگلے روز عبدالقدیر شاہ کے تھانے والے گاؤں چلا گیا۔ وہاں اُسے میرے گاؤں جانا تھا۔ وہ شام کو واپس آیا۔ اُس نے بتایا کہ گھوڑی شاہ صاحب کے پاس پہنچ گئی ہے اور شاہ صاحب نے میرے ماں باپ اور ہمارے نمبردار اور چوکیدار سے کہا ہے کہ وہ میرے گھر کی نگرانی کرتے رہیں اور میں آؤں تو فوراً تھانے اطلاع دیں۔ تھانیدار نے میرے ماں باپ سے پوچھا تھا کہ میرا کوئی دوست یا کوئی رشتہ دار ہے جس کے پاس

میں جاسکتا ہوں؟ میرے ماں باپ نے اُسے بتایا تھا کہ ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں اور میرے دوستوں کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ عبدالقدیر نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا تھا کہ وہ میرے ماں باپ کو تسلی دے آیا تھا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، اپنی بہن کے ساتھ بالکل خیریت سے ہوں۔

عبدالقدیر اپنے دو دوستوں کے ہاں بھی چلا گیا تھا۔ وہ دونو چوری چکاری اور رہزنی کرتے تھے۔ انہیں وہ اپنے گروہ میں شامل ہونے کے لئے کہہ آیا تھا۔ دونوں خوشی سے شامل ہوگئے۔ اُنہوں نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ عبدالقدیر اب صرف ڈاکے کی باتیں کرنے لگا۔ کبھی کبھی وہ یہ بھی کہتا تھا کہ ہم انگریزوں کو بھی لُوٹا کریں گے اور اُنہیں قتل بھی کیا کریں گے کیونکہ یہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، لیکن یہ اپنے آپ کو خوش کرنے والی بات تھی کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ جائز ہے۔ ڈاکہ ڈاکہ ہی ہوتا ہے، اسے تم جہاد نہیں کہہ سکتے۔ صاف بات ہے کہ عبدالقدیر کے خیالات جرم کی طرف مائل تھے اور وہ جنون سے متاثر تھا، اور میں انتقامی طور پر اس راستے پر چل پڑا تھا۔ بلّی بہت ہی کمزور جانور ہے لیکن اسے کمرے میں بند کر کے اس کے پیچھے پڑ جاؤ تو اس کی مجبوری اسے خونخوار بنا دیتی ہے اور وہ ایسا حملہ کرتی ہے کہ انسان کو لہولہان کر دیتی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔

میری بہن ماں باپ کے لئے پریشان تھی۔ وہ پوچھتی تھی کہ گھر کب جائیں گے۔ میں نے اُسے تسلّی دلاسہ دیا تھا اور بتایا کہ کچھ دن یہاں رہ کر چلے جائیں گے یا ماں باپ کو بھی یہاں لے آئیں گے۔ اُس کی تسلّی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اُسے کہہ تو دیا تھا کہ ماں باپ کو یہاں لے آئیں گے یا ہم چلے جائیں گے لیکن میں اور عبدالقدیر کچھ اور کر رہے تھے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شاہ تھانیدار کے گھر جو جالندھر سے چند میل دُور تھا، ڈاکہ ڈالا جائے۔

ایک روز عبدالقدیر اپنے دو جرائم پیشہ ساتھیوں کو اپنے گاؤں لے آیا۔ ہم رات کو ڈاکے کا پروگرام بناتے رہے۔ شاہ کا قصبہ عبدالقدیر کے گاؤں سے آٹھ نو میل تھا۔ شاہ کے گھر کے متعلق معلومات حاصل کرنی تھیں۔

عبدالقدیر اپنے ایک ساتھی کو لے کر چلا گیا۔ میں اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کے لئے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ دونو دوسرے دن واپس آئے۔ اُنہوں نے گھر دیکھ لیا تھا۔ یہ بھی معلوم کر لیا کہ گھر میں کتنے فرد ہیں۔ نوکر چاکر رات کو کہاں سوتے ہیں اور مکان میں داخل کس طرف سے ہونا ہے۔ گھر میں شاہ کا باپ تھا، ماں تھی، ایک جوان غیر شادی شُدہ بہن اور بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک بھائی۔ عبدالقدیر نے بتایا کہ صرف ایک کام باقی رہ گیا ہے۔ اس محلے کے چوکیدار کو ساتھ ملانا ہے۔ یہ پتہ چل گیا تھا کہ چوکیدار کوئی سکھ ہے۔ اگر عبدالقدیر یہ کام میرے سپرد کرتا تو میں کبھی نہ کر سکتا۔ میں حیران بھی ہُوا اور خوش بھی کہ ان دونوں نے جاسوسی کی ہے اور میں انہیں اُستاد ماننے لگا۔

تیسری رات ہم شاہ کے قصبے میں پہنچ گئے۔ ہم چار تھے۔ چاروں کے پاس لمبے چاقو تھے۔ دو کے پاس کلہاڑیاں اور دو کے پاس چھوٹی برچھیاں بھی تھیں۔ اُس زمانے میں ڈاکوؤں کے ساتھیوں کے پاس ایسی ہی برچھیاں ہُوا کرتی تھیں۔ ہم آدھی رات سے ذرا پہلے وہاں پہنچے تھے۔ سب سے زیادہ مشکل کام ابھی کرنا تھا۔ سکھ چوکیدار کو اپنے ساتھ ملانا تھا۔ اُس زمانے میں قصبوں میں سرکاری چوکیدار پوری رات پہرہ دیا کرتے تھے۔ میں نے عبدالقدیر سے کہا کہ چوکیدار نہ مانا تو کیا کریں گے؟ اُس نے کہا کہ نہیں مانے گا تو زندہ بھی نہیں رہے گا۔

ہم شاہ کے محلے میں گئے تو میں اور عبدالقدیر آگے گئے۔ ہمارے دوسرے ساتھی ایک جگہ چھُپ گئے۔ چاندنی بڑی صاف تھی۔ محلہ سنسان تھا۔ لوگ گھروں میں جیسے مرے پڑے تھے۔ سکھ چوکیدار سامنے سے آ رہا تھا۔ ہم اُس کے قریب جا کر رُک گئے۔ اُس نے ہم سے پُوچھا کہ کون ہو، کدھر جا رہے ہو۔ عبدالقدیر چالاک آدمی تھا۔ اُس نے دو چار باتیں کر کے سکھ کو دوست بنا لیا۔ اگر میں تمہیں وہ ساری باتیں سُناؤں جو عبدالقدیر نے چوکیدار کے ساتھ کی تھیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ تم یوں سمجھ لو کہ سکھ

جلدی موم ہوگیا اور اُس نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگ مطلب کی بات کرو۔

یہ ہم نے بعد میں محسوس کیا کہ سِکھ اتنی آسانی سے کیوں موم ہوگیا تھا۔ وہ اس سے پہلے دو تین چوریاں کروا چکا تھا اور وہ عبدالقدیر کی باتوں سے سمجھ گیا تھا کہ ہم کوئی واردات کرنے آئے ہیں اور اُس کی مدد کی ضرورت ہے۔ عبدالقدیر نے جب مطلب کی بات بتائی تو سِکھ نے اپنا ہاتھ آگے کر کے کہا ـــ "ہتھ آوے استاد"

وہ عبدالقدیر سے یہ سُن کر خوش ہُوا کہ ہم تھانیدار شاہ کے گھر ڈاکہ ڈالنے آئے ہیں۔ اُس نے کہا کہ اس گھر میں سب مال حرام کا ہے اور شاہ کا باپ اپنے آپ کو لوگوں کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ شاہ صاحب تھانیدار کے متعلق اُس نے بتایا کہ بدکار آدمی ہے۔ تھانیداری کے رُعب میں لوگوں کی بہو بیٹیوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ سِکھ نے بتایا کہ اس محلے میں کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہیں جو اس گھر کو اچھا کہتا ہو، بلکہ ہر کوئی ان کے خلاف ہے۔

یہ بھی وجہ جس سے سِکھ چوکیدار ہماری مدد کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ حصّے کی بات ہوئی تو اُس نے کہا کہ وہ نقد رقم لے گا کیونکہ زیور یا اور کوئی چیز رکھی تو پکڑا جائے گا۔ اُس نے کہا کہ اصطبل کی دیوار پھلانگ جاؤ۔ آگے تمہیں حویلی کا راستہ نظر آجائے گا۔ یہ راستہ ایک سیڑھی تھی جو حویلی کے صحن کی اندرونی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اصطبل کی دیوار آٹھ دس فٹ اُونچی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ عبدالقدیر میرے کندھے پر چڑھ کر دیوار پر گیا اور دوسری طرف اتر کر اُس نے دروازہ کھول دیا۔ باقی تین بھی اندر چلے گئے۔ اصطبل میں ایک گھوڑی اور کچھ مویشی بندھے ہوتے تھے۔ ساتھ والی دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی پڑی ہوئی تھی۔

چوکیدار نے اصطبل کا دروازہ بند کر دیا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے سیڑھی پر چڑھے۔ آگے ایک چھت تھی۔ وہاں سے ایک اور چھت پر گئے۔ عبدالقدیر ہمارے آگے تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ میرا پہلا جرم تھا اور پہلا ہی جرم بہت خطرناک تھا۔ چلتے چلتے سیڑھیاں آگئیں۔ ان سے

ہم نیچے اُتر گئے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے خُدا نے ہمارے راستے سے ہر رکاوٹ دُور کر دی ہو۔ میں خوش ہو رہا تھا کہ ڈکیتی تو بہت آسان کام ہے۔ سیڑھیوں سے اُترے تو صحن آگیا۔ حویلی کشادہ اور بڑی اچھی تھی۔ اُس زمانے میں امیروں کی حویلیاں آج کی کوٹھیوں کی طرح تنگ نہیں ہُوا کرتی تھیں۔

عبدالقدیر ہمیں ایک برآمدے میں لے گیا۔ ایک کمرے کی بڑی مدھم روشنی دروازے کی درزوں سے نظر آرہی تھی۔ عبدالقدیر نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو دروازہ کُھل گیا۔ ہم اندر گئے۔ سامنے چھوٹی سی میز پر ایک لالٹین رکھی تھی جس کی بتی بہت نیچی تھی۔ عبدالقدیر نے بتی اُونچی کر دی۔ کمرہ روشن ہوگیا۔ ایک مردانہ آواز آئی ـــ "کون ہے؟ بتی کیوں اُونچی کی ہے؟" ـــ فوراً وہ ہڑبڑا کر کچھ بولا۔ عبدالقدیر کے ایک دوست نے کلہاڑی اُس کے اُوپر کر کے کہا ـــ "منہ بند کر لو اور ٹرنکوں کی چابیاں ہمارے حوالے کر دو۔"

پھر شاہ صاحب تھانیدار کی ماں اور پھر بہن جاگی۔ وہ بھی ہڑبڑا کر کچھ نہ کچھ بولیں۔ ہم نے پگڑیوں کے پلّو چہروں پر لپیٹ رکھے تھے۔ میں نے شاہ کی بہن دیکھی۔ میری بہن کی طرح نوجوان اور خوبصورت تھی۔ میرے اندر انتقام کی آگ کا شعلہ اُٹھا۔ میں نے عبدالقدیر سے کہا کہ تم مال سمیٹو، مَیں اس لڑکی کو ساتھ لے جاؤں گا۔

"خبردار شامو!" ـــ عبدالقدیر نے مجھے ڈانٹ کر کہا ـــ "تم بھی بہن والے ہو۔ عورت پر کبھی ہاتھ نہ اٹھانا۔"

اُس نے ان سب سے کہا ـــ "رقم اور زیورات خود ہی ہمارے حوالے کر دو، ورنہ ہم الماریوں اور ٹرنکوں کے تالے خود ہی توڑ لیں گے اور اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

ان سب کی زبانیں خوف سے بند ہوگئی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے سب مر گئے ہوں۔ ہمارے ایک ساتھی نے گرج کر کہا ـــ "اُٹھو" ـــ تو تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شاہ کی بہن رونے لگی۔ وہ بُری طرح کانپ رہی

تھی۔ شاہ کی ماں نے کہیں سے چابیاں نکالیں اور ایک الماری کھولی۔ اس کے ساتھ ہی وہ روتے ہوتے منّت سماجت کرنے لگی کہ یہ زیورات اس کی بیٹی کے ہیں اور اس کی شادی ہونے والی ہے۔

"بڑھی مائی!" — میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "اپنے تھانیدار بیٹے سے کہنا کہ دوسروں کی بیٹیوں کی بھی شادی ہُوا کرتی ہے۔ اُس بدکار سے پوچھنا کہ اُس نے کبھی کسی کی بیٹی پر رحم کیا ہے؟ وہ تھانیداری کا رُعب دکھا کر لوگوں کی بیٹیوں کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ یہ سب دولت حرام کی ہے۔"

اس الماری میں سے چھوٹی سی ایک صندوقچی نکلی جس میں زیورات تھے۔ یہ کم از کم سوا سیر سونا تھا۔ عبد القدیر نے ساری الماری کی تلاشی لی۔ بغیر سِلے ریشمی کپڑے تھے لیکن ہمیں صرف زیورات کی ضرورت تھی۔ ایک ٹرنک میں سے گیارہ ہزار روپے کے نوٹ نکلے۔ ہم نے تمام ٹرنک کھلواتے۔ بوڑھا اور بُڑھیا ہمارے آگے ہاتھ جوڑتے رہے اور اپنی بیٹی کا واسطہ دیتے رہے۔ ہم نے سونا اور رقم ایک میز پوش میں باندھی اور چل پڑے۔

میں شاہ کی بہن کے پاس رُک گیا اور اُسے کہا — "اپنے تھانیدار بھائی سے کہنا کہ سب کی بیٹیاں تم جیسی ہیں اور انہیں تم جیسا سمجھے۔ ہم تمہیں اُٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ تمہیں یہاں خراب کر سکتے ہیں لیکن نہیں کریں گے۔"

ہمارے ایک ساتھی نے گھر والوں سے کہا — "ہمارے جانے کے بعد کسی کی اُونچی آواز نکلی تو ہم واپس آ کر اِس لڑکی کو اور اِس لڑکے (تھانیدار کے چھوٹے بھائی) کو اُٹھا لے جائیں گے۔"

ہم حویلی کے بڑے دروازے سے باہر نکلے اور بہت تیز چلتے گلی سے بھی نکل گئے۔ سکھ چوکیدار ہمارے انتظار میں تھا۔ عبد القدیر نے میز پوش اُس کے آگے کھول دیا اور کہا کہ اپنے ہاتھ سے جتنا لے سکتے ہو لے لو۔ اُس نے نوٹوں میں سے کچھ نوٹ لے لئے۔ ہم نے نہ دیکھا کہ اُس نے پانچ

کے نوٹ نکالے، دس کے یا سَو سَو کے نکالے۔ ہم اُس وقت بادشاہ تھے۔ ہماری پہلی واردات کامیاب تھی اور پہلی ہی واردات میں اتنا زیادہ مال ہاتھ لگا تھا۔ گیارہ ہزار روپے کا آج حساب کرو تو یہ رقم معمولی سی لگتی ہے۔ اُس زمانے میں جس کے پاس صرف گیارہ روپے ہوتے تھے وہ اکڑ کر چلا کرتا تھا۔ مَیں حیران ہو رہا تھا کہ ہمارے پاس گیارہ ہزار روپے آ گئے ہیں۔

ہم قصبے سے نکل آتے اور آدھے راستے میں بیٹھ کر عبد القدیر نے آدھی رقم اپنے دونوں ساتھیوں کو دے کر کہا کہ وہ اپنی پسند کے زیورات لے لیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ زیورات گھر کی عورتوں کو تو نہیں پہنائیں گے انہیں پگھلا کر سونا بیچ دیں گے۔ اُس نے عبد القدیر اور مجھ سے بھی کہا کہ ہم رات کو ہی تمام زیورات پگھلا کر سونے کی تین چار گولیاں بنا لیں اور یہ جالندھر نہ جا بیچیں۔ کسی اور شہر میں لے جائیں۔

ہم اپنے گاؤں میں صبح کی اذان سے پہلے پہنچ گئے اور سو گئے۔ دوپہر کے وقت ہم جاگے۔ عبد القدیر نے میرا حصہ الگ کر دیا۔ یہ اڑھائی ہزار روپیہ تھا جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ زیورات بھی تھے۔ عبد القدیر اپنا حصہ لے کر دوسرے کمرے میں اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔ میں نے اپنی بہن کو بلایا اور بڑی خوشی سے رقم اور زیورات اُس کے آگے رکھ کر کہا یہ لو، یہ تمہاری دولت ہے۔

میری بہن نے یہ دولت اور یہ سونا دیکھا، پھر میرے منہ کو دیکھا۔ اُس کا منہ کھُل گیا اور آنکھیں ٹھہر گئیں۔ میں نے قہقہہ لگایا تو اُس نے نظریں میرے چہرے پر جما دیں۔

"شامو!" — اُس نے ہکلاتی ہوئی آواز میں کہا — "سچ بتا، یہ روپیہ اور زیور کہاں سے آیا ہے۔"

"یہ اُس تھانیدار کے گھر سے آیا ہے جس نے تیری عزت پر بُری نظر رکھ کر تجھے تھانے بُلایا تھا" — میں نے کہا — "تیری خاطر اُس نے مجھے مشتبہ بٹھایا تھا۔"

"تُو نے ڈاکہ ڈالا ہے؟"

"تو کیا وہ یہ مال یہاں آکر مجھے دے گیا ہے؟" — میں نے کہا — "میں نے تھانیدار سے اپنی بے عزّتی کا بدلہ لیا ہے۔"

وہ میری چھوٹی بہن تھی۔ مجھے باپ کی جگہ سمجھتی تھی مگر اُس نے اس قدر زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا جیسے کمرے میں کسی نے پستول فائر کیا ہو۔

"یہ تُو نے اپنے باپ کا نام روشن کیا ہے؟" — اُس نے دانت پیس کر کہا — "بے غیرت . . . اُٹھ اور یہ رقم قادے کو دیدے اور مجھے جالندھر کے بازار میں بیچ آ، پھر لوگوں کو دکھانا کہ یہ دیکھو میرے پاس کتنی دولت ہے۔"

میری بہن بڑی خوبصورت تھی لیکن اُس کے دانت پِس رہے تھے اور اُس کی آنکھیں گوشت کی بوٹیوں کی طرح لال ہوگئی تھیں۔ اُس کی خوبصورتی جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ وہ تو ڈائن بن گئی تھی۔ مجھے اُس سے ڈر آنے لگا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ میں آیا۔

"یہ سب مال حرام کا تھا جو تھانیدار نے اپنے گھر جمع کر رکھا تھا" — میں نے کہا۔

"تجھے ایک ڈاکے میں مشتبہ بٹھایا گیا تھا" — بہن نے کہا — "میں تجھے بیگناہ سمجھتی تھی لیکن اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تُو اُس ڈکیتی میں بھی شامل تھا۔ اسی لئے تُو تھانے سے بھاگ آیا اور مجھے اس لئے ساتھ لے آیا کہ میری عزّت محفوظ رہے۔"

میں نے اُسے بتایا کہ وہ بچّی ہے، لوگوں کی نیّت کو اُن کی نظروں سے اور چہروں سے نہیں پہچان سکتی۔ تھانیدار نے اُسے پھانسنے کے لئے مجھے پھانسا تھا اور وہ جو عورت ہمارے گھر میں آتی تھی وہ تھانیدار کی بھیجی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے اس تھانیدار سے انتقام لیا ہے۔

"خود بھی زہر کھالے، مجھے بھی زہر دیدے" — اُس نے کہا — "ڈاکو . . . تجھے میری عزّت کا خیال ہے تو چل مجھے کہیں اور لے چل۔ دونو

محنت مزدوری کر کے پیٹ بھر لیا کریں گے۔"

اُس نے اتنا زیادہ شور مچایا کہ عبدالقدیر اور اُس کی بیوی آگئی۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ اس لڑکی کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ کہتی ہے کہ یہ مال باہر پھینک دے۔ وہ دونو اُسے سمجھانے لگے۔

"نہ بھائی جی!" — میری بہن نے عبدالقدیر سے کہا — "اگر تھانیدار کے گھر یہ رقم اور زیور حرام کے تھے تو یہ تم پر حلال نہیں ہو سکتے۔ مجھے یہ ڈر بھی لگ رہا ہے کہ تم لوگ پکڑے گئے تو پھر میری عزّت کی چوکیداری کون کرے گا؟"

"ہم نے کوئی کُھرا کھوج نہیں چھوڑا" — عبدالقدیر نے اُسے کہا — "ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ کوئی گواہ نہیں۔"

اُس وقت میری بہن نے ایسی بات کہی جس سے میں کانپ گیا اور میرے دل پر خوف بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا — "تم کہتے ہو کوئی گواہ نہیں؟ . . . اللہ گواہ ہے۔"

وہ بالکل اَن پڑھ اور دیہاتی لڑکی تھی جو صرف اتنا جانتی تھی کہ ہم دُنیا میں صرف اس لئے آتے ہیں کہ کام کریں اور پیٹ بھریں مگر اُس نے ایسی بات کہہ دی کہ مجھے چُپ لگ گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میری بہن کی زبان سے کوئی اور بول رہا ہو۔ میں چونکہ نیک نیّت آدمی تھا، کبھی چھوٹا سا جُرم بھی نہیں کیا تھا اس لئے میرے دل پر گھبراہٹ آگئی۔ عبدالقدیر زیادہ دلیر آدمی تھا۔ وہ ہنستا رہا۔ اُس نے کہا کہ یہ مال سنبھال لو۔ یہ تو بچی ہے۔ خود سمجھ جائے گی، مگر وہ روتی رہی۔ عبدالقدیر کی بیوی بہت خوش تھی۔

دوسرے دن عبدالقدیر شاہ صاحب کے تھانے والے گاؤں چلا گیا۔ واپس آکر اُس نے مجھے بتایا کہ شاہ اپنے گھر (قصبے میں) چلا گیا ہے کیونکہ اُس کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ اس تھانے کا ایک کانسٹیبل عبدالقدیر کا دوست تھا۔ اُس نے عبدالقدیر کو بتایا کہ شاہ صاحب کو مجھ پر شک ہے۔ کہتا تھا کہ شامو نے بدلہ لیا ہے لیکن وہ یہ بھی کہتا تھا کہ واردات چار آدمیوں نے کی ہے۔ شامو اکیلا

نہیں ہوسکتا۔ عبدالقدیر میرے ماں باپ سے بھی مل آیا تھا۔ انہیں تھانیدار نے پریشان نہیں کیا تھا۔ البتہ نمبردار انہیں ڈراتا رہتا تھا کہ شامُو کو واپس لائیں ورنہ ان کے لئے مصیبت بن جائے گی۔ اس سے میرے ماں باپ ڈرے ہوئے تھے اور روتے بھی تھے۔

ہمارے دوسرے دو ساتھی واردات والے قصبے میں گئے۔ انہیں چوکیدار نہیں پہچانتا تھا کیونکہ اُس کے ساتھ رات کے وقت ملاقات ہوتی تھی۔ بے شک چاندنی صاف تھی لیکن ہم نے چہرے پگڑیوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ ہمارے ساتھی اُس محلے میں گھومتے پھرتے رہے۔ اُنہوں نے تھانیدار شاہ صاحب کو بھی دیکھا تھا۔ وہاں کا تھانیدار بھی ساتھ تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے محلے کے دو تین آدمیوں سے پُوچھا تھا کہ یہ کس کا گھر ہے جس میں ڈاکہ پڑا ہے۔ اُنہوں نے انہیں بتایا اور باتوں باتوں میں ان آدمیوں سے پتہ چلا کہ پولیس کو جتّو پر شک ہے۔ تھانیدار کہتے ہیں کہ اتنی دلیری سے واردات کرنے والا صرف جتّو ہوسکتا ہے۔

دلچسپ چیز یہ معلوم ہوئی کہ چوکیدار نے یہ بیان دیا تھا کہ وہ اپنے پہرے کے دوران آدھی رات کے لگ بھگ گلی کی نُکڑ سے مُڑا تو دو آدمیوں نے اُسے دبوچ لیا۔ تیسرا آدمی سامنے آیا۔ اُس نے چوکیدار کی ناک پر رومال رکھ دیا۔ ایک دو منٹ بعد چوکیدار بے ہوش ہوگیا۔ اُسے محلے والوں نے اُٹھایا اور وہ ہوش میں آگیا۔ تب اُسے پتہ چلا کہ شاہ صاحب کے گھر کا صفایا ہوگیا ہے۔

محلے کے بہت سے آدمیوں نے چوکیدار کے بیان کی تصدیق کی اور کہا کہ شاہ کے گھر سے شور اُٹھا تو لوگ جاگ کر دوڑے آئے۔ ڈاکو جا چکے تھے۔ چوکیدار کی تلاش ہوئی تو یہ گلی کی نُکڑ پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ کسی نے کہا کہ مر گیا ہے۔ ڈاکو اسے قتل کر گئے ہیں لیکن نبضیں چل رہی تھیں۔ بہت دیر بعد وہ ہوش میں آیا لیکن اس کے قدم لڑکھڑاتے تھے۔

یہ بیان سُن کر ہی شاہ اور وہاں کے تھانیدار نے جتّو پر شک کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی معمولی چور اس طرح واردات نہیں کر سکتا۔ چار آدمیوں

سے اُنہوں نے یہ مطلب لیا تھا کہ یہ عام چوروں کا نہیں تجربہ کار ڈاکوؤں کا گروہ تھا۔ میں چوکیدار کی عقل پر حیران ہُوا۔ اُس نے بڑا اچھا بہانہ بنایا تھا۔ وہ اس کام کا استاد معلوم ہوتا تھا۔

اِدھر میری بہن کا دماغ دن بدن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اور کوئی بات کرتی ہی نہیں تھی۔ کہتی تھی کہ یہ رقم اور یہ زیور کہیں پھینک آؤ۔ عبدالقدیر کی بیوی کچھ اور چیز تھی۔ عبدالقدیر نے اُسے واردات کی ہر ایک بات بتا دی تھی۔ اُس نے بیوی کو یہ بھی بتایا کہ شاہ کی چھوٹی بہن کے ساتھ میں نے کیا باتیں کی تھیں اور شاہ کی ماں نے کس طرح ہاتھ جوڑ کر اور رو رو کر منتیں کی تھیں کہ یہ اُس کی بیٹی کا زیور ہے اور اُس کی شادی ہونے والی ہے۔ عبدالقدیر کی بیوی نے یہ باتیں میری بہن کو سُنا دیں۔ اُن سے میری بہن کا دماغ اور زیادہ بگڑ گیا اور وہ میرے پیچھے پڑ گئی۔

"شامُو!" — اُس نے مجھے الگ بٹھا کر کہا — "میری طرف دیکھو۔ میں بھی کسی ماں کی بیٹی ہوں۔ میری ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کر میرے لئے زیور بنایا ہے۔ وہ کوئی میری ماں سے چھین کر لے جائے تو اُس کی کیا حالت ہو گی۔ تُو نے مجھ جیسی ایک بہن کا دل دُکھایا ہے۔"

"تُو اپنے آپ کو اُس کے ساتھ نہ ملا پگلی!" — میں نے اُسے کہا — "وہ ایک ایسے تھانیدار کی بہن ہے جس نے یہ سارا زیور رشوت کے روپے سے بنایا تھا۔ وہ دو تین مہینوں میں اتنا ہی زیور پھر بنا لے گا۔ اس تھانیدار نے کبھی کسی کی بہن کی عزّت کا لحاظ نہیں کیا۔ اس نے تمہاری عزّت پر بھی بُری نظر رکھی ہوئی ہے۔"

"اگر تم اُسے قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤ تو میں فخر سے للکار للکار کر لوگوں سے کہوں گی کہ میرا بھائی میری عزّت پر قربان ہوگیا ہے" — اُس نے کہا — "میں یہ نہیں کہلانا چاہتی کہ یہ ایک ڈاکو کی بہن ہے۔"

اُسے بہت سمجھایا۔ میں نے بھی، عبدالقدیر نے اور اُس کی بیوی نے بھی لیکن وہ تو جیسے پاگل ہوگئی تھی۔ عبدالقدیر نے مجھے تسلّی دی کہ بچی ہے،

سمجھ جائے گی مگر میں اپنی بہن سے ڈرنے لگا تھا۔ میرے ساتھ اُس کا پیار ختم ہو گیا تھا اور وہ زیادہ تر روتی رہتی تھی۔

پھر ایسا واقعہ ہو گیا جو میرے لئے بہت ہی عجیب تھا۔ رات کا پہلا پہر گزر گیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ عبدالقدیر نے دروازہ کھولا۔ اُس کا یہ مکان دیہات کے عام مکانوں سے زیادہ بہتر تھا۔ ڈیوڑھی الگ تھی۔ میں اور عبدالقدیر ایک کمرے میں سوتے تھے۔ اُس کی بیوی اور میری بہن الگ کمرے میں رہتی تھیں۔ مویشیوں کے لئے کمرہ الگ تھا اور صحن بہت کھلا تھا۔

عبدالقدیر دروازہ کھولنے گیا تو بہت دیر تک واپس نہ آیا۔ مجھے کچھ شک سا ہوا۔ میں باہر چلا گیا۔ عبدالقدیر ڈیوڑھی میں کسی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور وہاں دیا جل رہا تھا۔ میں ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ وہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں دونوں کو نہیں جانتا تھا۔ ان میں ایک مجھے کسی ریاست کا نواب یا شہزادہ لگتا تھا۔ اتنی اچھی صورت اور اتنا اچھا قد بُت۔ اُس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اُس نے مجھے دیکھ کر عبدالقدیر کی طرف دیکھا۔ عبدالقدیر نے اُسے کہا کہ اپنا آدمی ہے۔ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

"شامُو!"— عبدالقدیر نے مجھے کہا —"اس سے ہاتھ ملاؤ۔ میں اسے پیر اُستاد مانتا ہوں۔ یہ جبّو ہے۔"

"جبّو؟"— میں حیران رہ گیا۔ یہ جبّو ڈاکو تھا۔ کیا ڈاکو اس شکل و صورت کے بھی ہوتے ہیں؟ میں نے آگے بڑھ کر اُس سے ہاتھ ملایا اور میں اُسے دیکھتا ہی رہا۔

بات یہ تھی جو عبدالقدیر نے مجھے بتائی کہ جبّو کو دو دِن عبدالقدیر کے گھر میں چھُپے رہنا تھا۔ انہوں نے مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ اتنا ہی کہا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ عبدالقدیر نے میرے متعلق اُسے بتایا کہ شاہ صاحب تھانیدار نے مجھے ڈکیتی کی اس واردات میں مشتبہ بٹھا لیا تھا جو فلاں گاؤں میں ہندو کے گھر ہوئی تھی۔ عبدالقدیر نے اُسے ساری بات سُنا دی جس میں میری

بہن کا ذکر تفصیل سے کیا اور تھانے سے میرے فرار کی بات بھی سُنائی۔

"یہ شاہ صاحب میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا"— جبّو نے کہا —"مجھے پکڑ نہیں سکتا۔ اپنے علاقے میں رات کو گشت سے ڈرتا ہے اور غریبوں کی بیٹیوں پر شیر ہوتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اُس کے ماں باپ کے گھر کا صفایا ہو گیا ہے اور شاہ صاحب اور واردات والے تھانے کا سکھ تھانیدار میرا نام لے رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کس کی واردات ہے .... جس کسی کی ہے، اُس نے نیکی کا کام کیا ہے۔"

عبدالقدیر نے ہنس کر کہا —"بھائی جبّو! میں تمہیں بتاؤں یہ واردات کس کی ہے؟"

"تمہیں کیسے پتہ ہے؟"— جبّو نے پوچھا۔

"یہ میری اور شامُو کی واردات ہے"— عبدالقدیر نے کہا —"ہمارے ساتھ دو آدمی اور تھے۔"

جبّو اتنا حیران ہوا کہ کچھ دیر مجھے اور عبدالقدیر کو دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا —"میں نے تمہیں کہا تھا کہ میرے پاس آ جاؤ تو تم نے انکار کر دیا تھا۔ اب خود ہی راستے پر آ گئے ہو۔"

"میں شاید اب بھی اس طرف نہ آتا"— عبدالقدیر نے کہا —"شامُو میرا جگری یار ہے۔ اس نے کہا کہ شاہ سے انتقام لینا ہے۔ میں نے کہا کہ دوست یہ نہ کہے کہ وفا دامنہ پھیر گیا ہے۔ ہم تو وہ ہیں جنہوں نے انگریزوں سے اپنی بے عزتی کا انتقام لے لیا تھا۔ یہ تو ایک ذرا سے علاقے کا تھانیدار ہے۔"

"کوئی کھُرا کھوج تو نہیں چھوڑ آتے تھے؟"— جبّو نے پوچھا —"مال اِدھر اُدھر کرتے خیال رکھنا کہ کوئی چیز پکڑی نہ جائے۔"

ہم نے اُسے بتایا کہ صرف زیورات اور نقدی لاتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ سونا فوراً پگھلا کر چھُپا دو اور کسی دُور کے شہر میں بیچنا۔ اُس نے ہمیں اور بھی بہت کچھ بتایا اور پوچھا کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ عبدالقدیر نے اُسے بتایا کہ ابھی سوچا نہیں۔ جبّو نے کہا کہ ہم دونوں اُس کے پاس آ جائیں۔ عبدالقدیر

نے کہا کہ ذرا ہاتھ کھل جاتے تو بتائیں گے۔ شاید آہی جائیں۔

تم شاید سوچ رہے ہو گے کہ ہم نے اُسے بتا دیا تھا کہ یہ ڈاکہ ہم نے ڈالا ہے لیکن اُس زمانے میں ڈاکوؤں کا ایک اصول تھا کہ ایک دوسرے کی واردات کا پتہ چل جاتے تو اسے راز ہی رہنے دیتے تھے۔ جبّو نے بھی تو بتا دیا تھا کہ ہندو ساہوکار کے گھر کا صفایا اُس نے کیا تھا۔ عبدالقدیر پر اُسے بھروسہ تھا۔

اگلے روز جبّو نے میری بہن کو دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میری بہن کو بڑی غور سے دیکھ رہا تھا اور میری بہن نے بھی اُسے غور سے دیکھا پھر اُسے کنکھیوں سے دیکھتی رہی۔ جبّو نے جوش سے کہا "اس معصوم لڑکی پر شاہ نے بُری نظر ڈالی تھی؟... میں اُس کی آنکھیں نکال دوں گا۔"

اتنے میں عبدالقدیر کی بیوی بھی آگئی اور ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ ہم نے ان دونوں عورتوں کو نہ بتایا کہ یہ آدمی جبّو ڈاکو ہے۔ انہیں یہ بتایا کہ یہ دونوں ہمارے گھر کے دوست ہیں اور رسالے میں ہمارے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ جبّو کا ساتھی خاموش تھا۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتا تھا۔ جبّو کی طبیعت میں ہنسی مذاق زیادہ تھا۔ اُس نے گپیں شروع کیں تو عبدالقدیر کی بیوی اور میری بہن ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگیں۔ اس سے پہلے میں نے اپنی بہن کو اس طرح ہنستے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سارا دن خوش رہی اور کھانا بھی وہی لائی۔

پھر رات آئی۔ رات کے آخری پہر جبّو اور اُس کے ساتھی کو چلے جانا تھا۔ عبدالقدیر کی بیوی اور میری بہن ہمارے پاس آ بیٹھیں۔ میری بہن شرماتے شرماتے جبّو کو خوش گپیوں پر اُکسا رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا اور اُس نے بڑی دلچسپ باتوں سے دونوں کو ہنسانا شروع کر دیا۔ بہت دیر تک گپ چلتی رہی، پھر ہم سو گئے۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازے پر بڑی آہستہ سے دستک ہوئی۔ عبدالقدیر اُٹھا تو جبّو نے کہا ـــــ "قادے! ذرا ہوشیار ہو کے۔ یہ دستک خیریت کی معلوم نہیں ہوتی۔"

عبدالقدیر نے جا کر دروازہ کھولا اور فوراً آ گیا۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا ـــــ "جبّو! نکل جاؤ... چوکیدار ہے۔ کہہ رہا ہے کہ مہمانوں کو رخصت

کر دو۔ پولیس آ رہی ہے۔"

جبّو نے گاؤں کے چوکیدار سے کہہ رکھا تھا کہ وہ یہاں ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ نامی گرامی ڈاکوؤں کے عام لوگوں کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات ہوتے تھے اور چوکیداروں کو وہ روپے پیسے سے خوش رکھتے تھے۔ اِس گاؤں میں آکر جبّو نے چوکیدار کو بتا دیا تھا کہ اِدھر اُدھر دھیان رکھے۔ یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا تھا کہ چوکیدار کو کس طرح معلوم ہوا تھا کہ پولیس آ رہی ہے۔ اُسے تھوڑی ہی دیر پہلے نمبردار نے بتایا تھا کہ گاؤں میں پھرتا رہے، رات کسی بھی وقت پولیس آ جائے گی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نمبردار کو گاؤں میں جبّو کی موجودگی کا کس طرح علم ہو گیا تھا۔

جبّو ہمیں کہہ رہا تھا ـــــ "پولیس کو اگر یہ پتہ چل گیا ہے کہ میں اس گاؤں میں ہوں تو اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں اس گھر میں ہوں۔ تم جانتے ہو کہ کسی مجرم کو پناہ دینا جرم ہے۔ پولیس تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ تمہارے پاس واردات کا مال بھی ہے۔ میں اگر نکل گیا تو تم پکڑے جاؤ گے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم سب میرے ساتھ چلو، یا مال مجھے دے دو۔ خطرہ ٹل جائے گا تو مال تمہارے پاس واپس آ جائیگا۔"

"مال بے شک لے جاؤ" ـــــ عبدالقدیر نے کہا ـــــ "خطرہ شامُو کے لئے ہے۔ یہ تھانیدار کی گھوڑی پر تھانے سے بھاگا ہوا ہے۔ یہ پکڑا گیا تو اس پر شاہ نے پہلے ہی الزام لگا رکھا ہے کہ جبّو کا ساتھی ہے۔ یہ الزام بالکل غلط ہے مگر اب لوگ اسے صحیح مانیں گے۔"

چوکیدار بتا گیا تھا کہ پولیس آ رہی ہے۔ اُس نے یہ نہ کہا کہ پولیس آ گئی ہے۔ ہم ابھی آپس میں بحث کر رہے تھے کہ کیا کریں کہ دروازے پر بڑی زور سے دستک ہوئی۔ جبّو دبے پاؤں گیا اور دروازے سے کان لگائے۔ وہ دبے پاؤں آیا اور بولا ـــــ "پولیس ہے۔"

دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ جبّو پولیس کے گھیرے سے کئی بار نکلا تھا۔ اُس نے کہا ـــــ "دونوں لڑکیوں کو جگا لاؤ۔ ان کی بڑی بے عزتی ہو گی۔"

دونوں دروازے کی دھکڑ دھکڑ پر ہی جاگ اُٹھی تھیں۔ وہ صحن میں آگئیں۔ جبّو نے ہمیں کہا کہ مال نکال کر کپڑوں کے اندر باندھ لو اور نکلنے کی کوشش کرو۔ جبّو نے مجھے آخری بات یہ کہی — "میں تمہاری بہن کو اپنے ساتھ رکھتا ہوں"۔ اور اُس نے اپنے ساتھی سے عبدالقدیر کی بیوی کے متعلق کہا "تم اسے ساتھ لے لو... شامُو اور قادا اناڑی ہیں، انہیں پکڑوا دیں گے۔ خود مر جاؤ، عورت پولیس کے ہاتھ نہ آئے۔"

جبّو صحن میں کہیں غائب ہو گیا۔ شاید کُرلی کے پیچھے ہو گیا تھا۔ دروازہ کسی نے نہ کھولا۔ میں نے دو تین آدمی باہر سے دیوار پر چڑھتے ہوئے دیکھے اور للکار سُنائی دی — "جبّو! سامنے آجاؤ نہیں تو گولی چلے گی" — چاندنی میں مَیں نے دیکھا کہ جبّو نے میری بہن کا بازو پکڑا تھا اور وہ اُس کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ جبّو کا ساتھی عبدالقدیر کی بیوی کی طرف دوڑا اور اس کے ساتھ ہی دیوار سے آدمی کُود آئے اور ان میں سے کسی نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔ اس کے بعد مجھے پتہ نہیں چلا کہ کون کدھر گیا۔

میں چھُپ گیا اور مجھے پہلو کی دیوار پر چڑھ جانے کا موقع مل گیا لیکن

ایک آواز سُنائی دی — "زندہ پکڑنے کی کوشش کرنا" — میں دیوار پر چڑھ کر ابھی سیدھا نہیں ہُوا تھا کہ نیچے سے کسی نے میرا کُرتہ پکڑ کر اتنی زور سے کھینچا کہ میں پیچھے کو گرا اور نیچے آپڑا۔ میں اُٹھا تو میرے سَر کے پچھلے حصے پر لاٹھی پڑی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا، پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

میں جب ہوش میں آیا تو میں ایک کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔ وہاں ایک تھانیدار اور پولیس کے تین چار کانسٹیبل تھے۔ گاؤں کے دو تین آدمی بھی تھے۔ یہ تھانیدار اِس علاقے کا تھا۔ مجھے پانی پلایا گیا۔ تھانیدار نے مجھ سے پوچھا کہ جبّو کہاں ہے؟۔ میں سمجھ گیا کہ جبّو اِن کے ہاتھ نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ مَیں نے جبّو کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی۔ کسی نے کہا کہ یہ آدمی اس گاؤں کا نہیں۔ ایک دوبار قادے کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔

تھانیدار مسلمان تھا۔ اُس نے سب کو باہر نکال دیا اور شرافت اور محبت

سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں کا رہنے والا ہوں۔ اُس نے کہا کہ میں اب بھاگ نہیں سکتا۔ بہتر ہے کہ میں اپنی ہڈی پسلی ایک کرانے کی بجائے شرافت سے بتا دوں۔ میں اُسے ٹالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ تھانیدار تھا، اور وہ کسی نیک خاندان کا آدمی تھا۔ شاہ صاحب بھی تھانیدار تھا۔ وہ بات بات میں ماں بہن کی گالیاں دیتا تھا۔ یہ بھی تھانیدار تھا لیکن دوستوں کی طرح بات کرتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اُسے ٹال رہا ہوں۔ میں عادی مُجرم تو نہیں تھا۔ مجھے شاہ صاحب کی طرف سے ایک چوٹ پڑی تھی اس لئے میں نے غصّے میں یا انتقام میں یہ واردات کی تھی۔

اس تھانیدار کا نام امین یا رحیم تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ اتنا یاد ہے کہ وہ جہلم ضلع کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ خُدا نے اُسے جنّت میں جگہ دی ہوگی۔ بے شک وہ چالاک تھا لیکن اُس نے شفقت سے بات کی جیسے وہ تھانیدار ہے ہی نہیں۔ میرے آنسو نکل آتے اور میں نے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ میں کون تھا اور میں کیا بن گیا ہوں۔ میں نے اُسے جھانسی میں اپنے رسالے کی بغاوت کا پورا واقعہ سنایا۔ میں نے دیکھا کہ تھانیدار کے چہرے پر جیسے خون چڑھ آیا ہو۔ وہ پکّا مسلمان تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ مذہب کا پابند ہے اور دیندار آدمی ہے۔

پھر شاہ صاحب تھانیدار نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ سنایا جس میں اپنی بہن کا پورا ذکر تھا۔ شاہ نے جس طرح میرے گھر کی تلاشی لی اور مجھے تھانے لے گیا اور پھر میرے ماں باپ کو اور میری بہن کو تھانے بلایا اور جس طرح میں وہاں سے بہن کو گھوڑی پر بٹھا کر بھاگا، اس طرح سُنایا کہ میرے آنسو روکنے کے باوجود نہیں رُکتے تھے۔ تھانیدار نے دانت پیس کر آہستہ سے کہا — "اس شخص کو خُدا دُنیا میں سزا دے گا۔ وہ تو فرعون ہے۔"

میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میری اور میری بہن کی شادی ہونے والی تھی لیکن شاہ نے ہماری قسمت تباہ کر دی ہے۔

"تمہاری بہن اب کہاں ہے؟" — تھانیدار نے پُوچھا۔

"بھی میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "جب پولیس قادے کے گھر میں آئی اُس وقت جبّو میری بہن کو بازو سے پکڑ کر ساتھ لے گیا اور صحن میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔"

"تو کیا واقعی جبّو اس مکان میں موجود تھا؟" — تھانیدار نے پُوچھا۔

"وہ شاید آپ کے گھیرے سے نکل گیا ہے" — میں نے کہا — "قادے کے گھر میں یہ اُس کی دوسری رات تھی۔"

اُس نے مجھ سے جبّو کے متعلق جو کچھ پُوچھا، میں نے سچ سچ بتا دیا۔ اس سے پتہ چلا کہ جبّو کی ایک پُرانی واردات اس تھانیدار کے علاقے کی بھی تھی۔ جبّو عبدالقدیر کے گھر میں آیا تو کسی نے تھانیدار کو اطلاع دے دی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ میں نے تھانیدار کو بتایا کہ ہمیں چوکیدار نے خبردار کیا تھا کہ پولیس آ رہی ہے، تو تھانیدار نے کہا کہ اسی چوکیدار نے اُسے اطلاع دی تھی کہ جبّو اپنے ایک ساتھی کے ساتھ عبدالقدیر کے گھر آیا ہُوا ہے۔ بعض چوکیدار، مُخبر اور نمبردار دونوں طرف کی جاسوسی کیا کرتے تھے۔ پولیس کو بھی خوش رکھتے اور جبّو جیسے ڈاکوؤں کو بھی۔

اس کے بعد میں نے تھانیدار رحیم (یا امین) کو بتایا کہ میں نے عبدالقدیر اور اس کے دو دوستوں کے ساتھ مل کر شاہ صاحب تھانیدار کے ماں باپ کے گھر ڈاکہ ڈالا ہے اور ہماری مدد وہاں کے ایک سکھ چوکیدار نے کی تھی۔ تھانیدار رحیم اس طرح سُن رہا تھا جیسے کوئی بچّہ اپنی ماں سے دلچسپ کہانی سُن رہا ہو۔ میں نے اُسے بتایا کہ چوری چکاری میرا پیشہ نہیں اور یہ میرا پہلا جرم ہے جو میں نے انتقام کی خاطر کیا ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میری بہن مجھ پر کس طرح لعن طعن کرتی رہی ہے اور روتی رہتی ہے کہ میں نے یہ جُرم کیا ہے

اُس نے نہ زیور کو ہاتھ لگایا ہے نہ پیسوں کو، حالانکہ ہم غریب لوگ ہیں۔

میں نے اپنے حصّے کے زیورات اور نوٹ ایک کپڑے میں باندھ کر کُرتے کے نیچے کمر کے ساتھ باندھ رکھے تھے۔ میں نے یہ پوٹلی کھول کر اُس کے آگے رکھ دی۔ میں بے بسی کے لہجے میں بیان دے رہا تھا جیسے میں شکست

کھا کر گِر پڑا تھا لیکن معلوم نہیں ایسے کیوں ہُوا کہ میں اچانک دلیر ہو گیا۔ میں نے تھانیدار سے کہا کہ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ سکتا ہوں۔ آپ کے پاؤں پڑ سکتا ہوں لیکن میں نے ایک ایسے شخص سے اپنی بے عزتی کا انتقام لیا ہے جس کے خلاف میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہتھکڑیاں اُس کے پاس ہیں، تھانے کا حاکم وہ ہے اور قانون اُس کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے صرف اپنے اللہ کا آسرا ہے اور اللہ گواہ ہے کہ میں نے آپ کو جو کچھ سنایا ہے، لفظ بہ لفظ سچ ہے۔ میں آپ کی مِنّت نہیں کروں گا کہ میرا جُرم بخش دیں۔ میں نے تو انگریزوں کے خلاف ہتھیار اُٹھا لیتے تھے۔

تھانیدار گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کبھی مجھے دیکھتا کبھی سَر جھکا لیتا۔ میں کچھ حیران بھی ہو رہا تھا کہ یہ کیسا تھانیدار ہے کہ نہ گالیاں دے رہا ہے نہ رُعب جھاڑتا ہے۔

"اگر ڈکیتی کی یہ واردات جو تم نے شاہ صاحب کے ماں باپ کے گھر کی ہے، میرے تھانے کے علاقے میں ہوتی تو میں تمہاری مدد کر سکتا تھا" — اُس نے کہا — "وہاں ایک سکھ تھانیدار ہے۔ مجھے زیادہ ڈر شاہ صاحب کا ہے۔ وہ تمہیں زیادہ سے زیادہ سزا دلانے کی کوشش کرے گا،

پھر بھی میں تمہارے لئے کچھ کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ تم نے مجھے جو بیان دیا ہے یہ تمہیں سارے کا سارا، بالکل اسی طرح ایک مجسٹریٹ کے سامنے دینا پڑے گا۔ وہ بیان لکھ لے گا اور تمہیں پڑھ کر سنائے گا۔ تم اس پر انگوٹھا لگا دینا۔"

تم سمجھ گئے ہو گے کہ وہ مجھے سلطانی گواہ بنا رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ جس طرح کہے گا میں ویسے ہی کروں گا لیکن مجھے میری بہن واپس مل جائے۔

"تمہاری بہن کو جبّو اپنے ساتھ لے گیا ہے" — تھانیدار نے کہا — "تم جانتے ہو وہ ڈاکو ہے۔ پولیس اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے وہ پکڑا گیا تو تمہاری بہن بھی مل جائے گی۔"

تم سمجھ نہیں سکتے کہ میرا کیا حال ہُوا ہوگا۔ اپنی بہن کی عزّت کی خاطر میں نے اتنا بڑا خطرہ مُول لیا تھا کہ تھانے میں سے بھاگ گیا تھا۔ وہ بہن میرے ہاتھ سے نکل گئی اور ایک ڈاکو کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دی کہ عبدالقدیر جبّو کے ساتھ ہوگا۔ اُس نے میری بہن کو اپنی بہن کہا تھا، لیکن میں اپنے جرم کا اقبال کر چکا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا کیا بنے گا۔ مجھے تو کئی سالوں کی قید نظر آ رہی تھی۔

تھانیدار مجھے اپنے تھانے میں لے گیا اور وہاں میرے ایک ہاتھ کو ہتھکڑی لگا کر ایک کمرے میں چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔ مجھ پر ایک کانسٹیبل کا پہرہ کھڑا کر دیا گیا۔ مجھے حوالات میں اس لئے نہ بند کیا گیا کہ وہاں عبدالقدیر اور جبّو کا ساتھی بند تھا اور عبدالقدیر کی بیوی زنانہ حوالات میں تھی۔ یہ مجھے پہرے والے کانسٹیبل نے بتایا تھا۔ جبّو پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ میری بہن کو وہی لے گیا تھا۔

تیسرے دن تھانیدار مجھے اُس قصبے کے تھانے میں لے گیا جس میں شاہ صاحب کے ماں باپ رہتے تھے۔ میں ہتھکڑیوں میں تھا۔ مجھے الگ بٹھا دیا گیا اور تھانیدار رحیم ڈیڑھ دو گھنٹے اِس تھانے کے سکھ تھانیدار کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر مجھے دونوں کے سامنے لے گئے اور مجھے بتایا گیا کہ میں ڈکیتی کی اِس واردات کا سلطانی گواہ ہوں۔ اُسی روز مجھے جالندھر ایک مجسٹریٹ کے سامنے لے گئے۔ میری ہتھکڑی اُتار دی گئی اور مجسٹریٹ کے پاس مجھے اکیلا چھوڑ کر پولیس باہر نکل گئی۔ مجسٹریٹ نے مجھے کہا کہ میں بیان دینے یا نہ دینے میں آزاد ہوں، اور اگر پولیس نے مجھے مار پیٹ کر اقبالِ جرم کے لئے مجبور کیا ہے تو میں بتا دوں اور بیان دینے سے انکار کر دوں۔

میں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ مجھے کسی نے بیان دینے کے لئے مجبور نہیں کیا۔ میں نے وہی بیان دیا جو تھانیدار رحیم کو دیا تھا۔ مجسٹریٹ نے بیان لکھ کر میرا انگوٹھا لگوا لیا۔ مجھے تھانیدار رحیم نے بتایا کہ مجھے کچھ دن جیل میں رہنا پڑے گا کیونکہ باہر میرے لئے خطرہ ہے۔ مجھے مجسٹریٹ کے

حکم سے جیل بھیج دیا گیا۔

پھر مقدمہ چلا۔ عدالت میں میرا بیان پڑھ کر سُنایا گیا اور مجھ سے پُوچھا گیا کہ کیا میں نے یہ بیان دیا تھا؟ میں نے کہا کہ میں نے یہ بیان اپنی مرضی سے دیا تھا۔ عبدالقدیر کے دو ساتھی بھی میری نشاندہی پر پکڑے گئے تھے۔ اِن تینوں کے خلاف ڈکیتی کا مقدمہ تھا۔ عبدالقدیر پر دوسرا مقدمہ یہ تھا کہ اُس نے جبّو نام کے ایک مُجرم کو جس کے متعلق وہ جانتا تھا کہ کئی وارداتوں میں مطلوب ہے، پناہ دی اور اُسے فرار میں مدد دینے کے لئے پولیس کا مقابلہ کیا۔

مقدمے کی کارروائی کی تفصیل سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں مختصر بات سُنا رہا ہوں۔ مجھے مقدمہ شروع ہوتے ہی آزاد کر دیا گیا تھا۔ میں اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ وہاں سے مقدمے کی پیشی پر جایا کرتا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ اب پھر شاہ صاحب تھانیدار مجھے پریشان کرے گا مگر وہ مجھے نظر ہی نہ آیا۔ نمبردار بھی میرے قریب نہیں آتا تھا۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ میرے بیان پر اُسے لائن حاضر کر دیا گیا تھا، یعنی اُسے تھانے سے ہٹا کر جالندھر پولیس لائنز میں بھیج دیا گیا تھا۔

آخر مقدمے کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔ عبدالقدیر کو پانچ سال ڈکیتی میں اور دو سال جبّو کو پناہ دینے میں قید کی سزا دی گئی۔ اُس کے دونوں ساتھیوں کو چار چار سال قید ملی اور عبدالقدیر کی بیوی کو بری کر دیا گیا۔ میں چونکہ سلطانی گواہ تھا اس لئے مجھے سزا نہ دی گئی۔ جبّو کا جو ساتھی پکڑا گیا تھا، اُسے عدالت میں پیش نہ کیا گیا۔

مجھے اب اپنی بہن کو ڈھونڈنا تھا۔ میں جبّو کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

گاؤں میں ہمارے گھرانے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ہم غریب لوگ تھے۔

ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں سبھی غریب کسان تھے۔ ہمارے قریب دو بڑے گاؤں تھے۔ وہاں اُونچی ذاتوں کے مسلمان، ہندو اور سکھ رہتے تھے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم ان دو بڑے گاؤں کے سائے میں رہتے ہیں۔

میں نہیں جو واقعہ سُنا چکا ہوں یہ کوئی معمولی واردات نہیں تھی۔ پولیس آئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ مقدمہ چلا۔ جبّو ڈاکو کا نام ہر کسی نے سُنا اور یہ معمولی بات نہیں تھی کہ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو جبّو اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ لڑکی میری بہن تھی۔ میں اس سارے واقعہ میں شامل تھا اس لئے لوگ مجھے یوں دیکھتے تھے جس طرح بچّے مداری کے ریچھ کو دیکھا کرتے ہیں۔

مجھ پر لوگوں کی انگلیاں اُٹھتی تھیں۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر ہمدردی کی باتیں کرتے تھے اور پرے جاکر کوئی کہتا کہ میں جبّو ڈاکو کا ساتھی ہُوں اور سرکار سے پیسہ لے کر اپنے ساتھیوں کو پکڑوایا ہے۔ کوئی کہتا کہ میں نے اپنی بہن جبّو کو دے دی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ میری بہن خود جبّو کے ساتھ چلی گئی ہے۔

اشرف بیٹا! تم سمجھ سکتے ہو کہ لوگ کیسی کیسی باتیں کیا کرتے ہیں۔ ہم بھی دوسروں کے متعلق ایسی ہی من گھڑت باتیں کرتے ہیں لیکن ایسی باتیں اُس وقت جھوٹی لگتی ہیں جب یہ ہمارے خلاف کی جاتی ہیں۔ میرا تو جینا مشکل ہوگیا تھا۔ میرے ماں باپ مجھے الگ بُرا بھلا کہتے اور روتے تھے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ دونوں ٹانگیں کٹ جائیں، دونوں بازو کٹ جائیں یا انسان اندھا ہو جائے تو اُسے اتنا دُکھ اور غم نہیں ہوتا ہوگا جتنا مجھے لوگوں کی باتوں سے ہُوا۔

غم صرف لوگوں کی باتوں کا نہیں تھا، میرا اصل روگ میری بہن تھی جسے جبّو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس بہن کی عزت کی خاطر میں نے تھانیدار شاہ صاحب سے دشمنی پیدا کرلی تھی اور انتقام لینے کے لئے اُس کے گھر ڈاکہ ڈالا تھا۔ خُدا نے مجھے دل بہت مضبوط دیا تھا ورنہ میں گاؤں سے بھاگ جاتا یا خودکشی کرلیتا۔ میں نے لوگوں کی باتوں اور طعنوں سے توجّہ ہٹالی اور اس سوچ میں گُم ہوگیا کہ بہن کو جبّو سے کس طرح واپس لوں۔

کبھی یہ خیال آتا کہ جبّو کے متعلق مشہور تھا کہ کسی اکیلے دکیلے راہ جاتے آدمی کو نہیں لُوٹتا اور وہ غریبوں کا غمخوار اور مددگار ہے اور وہ بڑے بڑے

سیٹھوں کو لوٹتا اور پولیس سے ٹکّر لیتا ہے۔ اس سے مجھے یہ امید ہوتی کہ جبّو میری بہن مجھے واپس کر دے گا مگر جب میں یہ سوچتا کہ میں نے وعدہ معاف گواہ بن کر اپنے ساتھیوں کو سزا دلائی ہے تو میرا دل بیٹھ جاتا کہ جبّو میری بہن کو اپنی داشتہ بنا کر مجھ سے بدلہ لے رہا ہے۔

عبدالقدیر اور اُس کے ساتھیوں کے خلاف جب مقدمہ شروع ہُوا تھا تو ہمارے تھانے سے شاہ تھانیدار کا تبادلہ کہیں اور کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ تھانیدار رحیم آگیا تھا۔ اس سے مجھے یہ خوشی ہوئی کہ تھانیدار رحیم رحمدل انسان تھا اور شاہ صاحب میرا دشمن تھا۔ جب مقدمہ ختم ہُوا اور سب کو سزا ہوگئی تو میں تھانیدار رحیم سے ملنے تھانے چلا گیا۔ وہ محبت اور شفقت سے ملا اور مجھ سے پُوچھا کہ کیسے گزُر رہی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ لوگ باتیں بنا بنا کر پریشان کرتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ وہ نمبردار اور ذیلدار کو تھانے بلا کر سختی سے کہے گا کہ میرے خلاف کسی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اُس نے لوگوں کی زبان بند کرنے کا یہ انتظام کر دیا تھا مگر لوگ دبی دبی زبان میں میرے خلاف اپنی عادت پوری کرتے رہے۔ مجھے فائدہ صرف یہ ہُوا کہ نمبردار، ذیلدار اور چوکیدار وغیرہ اس وجہ سے میری عزّت کرنے لگے کہ میں تھانیدار کا آدمی ہوں۔

تھانیدار رحیم کے ساتھ اِس ملاقات میں میں نے روتے ہوئے اُسے کہا کہ جبّو سے میری بہن واپس کرادے۔ میں جب عبدالقدیر کے گھر سے بھاگتے پکڑا گیا تھا تو میں نے تھانیدار کے آگے اقبال جُرم کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ تھانیدار شاہ صاحب نے میری بہن کو پھانسنے کے لئے مجھے جبّو کی ایک واردات میں پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ میں جھانسی میں اس بات پر انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شریک ہُوا تھا کہ ہمیں تُرکوں کے خلاف لڑنے کے لئے سمندر پار بھیجا جا رہا تھا۔

یہ تھانیدار صحیح معنوں میں مسلمان تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اُس کے دل میں میری قدر اور عزّت ایک تو اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ میں نے وعدہ معاف گواہ بن کر

پولیس کا کام آسان کر دیا تھا اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ میں نے ترکوں کے خلاف نہ لڑنے پر اپنا مستقبل قربان کر دیا تھا۔ بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے تھانیدار رحیم کو تھانیدار شاہ صاحب کے متعلق جو کچھ بتایا تھا، وہ اُس نے اپنے بالائی افسروں کو لکھ بھیجا تھا۔ اس پر شاہ صاحب کو پہلے لائن حاضر کیا گیا پھر کسی دُور دراز جگہ بھیج دیا گیا تھا۔

تھانیدار رحیم نے مجھے کہا کہ وہ جبّو کے تعاقب میں ہے۔ جس روز وہ پکڑا گیا مجھے میری بہن واپس مل جائے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اگر بہن کی تلاش میں نہ نکلا تو میں اپنے آپ کو مرد نہیں سمجھوں گا اور اگر جبّو مجھے مل گیا تو میں اُسے قتل کر دُوں گا یا اُس کے ہاتھوں قتل ہو جاؤں گا۔

تھانیدار نے مجھے روک دیا اور کہا کہ مجھے جبّو نہیں ملے گا۔ مِل بھی گیا تو میں اُس کے ہاتھوں قتل ہو جاؤں گا اور میری بہن اُسی کے قبضے میں رہے گی۔ میں اس قدر جلا ہُوا تھا کہ میں تھانیدار کی بات مان نہیں رہا تھا مگر اُس نے ایسی دلیلیں دیں کہ مجھے اُس کی بات ماننی پڑی۔

اُس نے مجھے مخبر بننے کو کہا۔ کہنے لگا کہ وہ میرے لئے آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنا چاہتا ہے مگر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایسی آمدنی مجھے پسند نہیں جو چغلی اور مخبری سے حاصل ہو۔ اس سے اُس کے دل میں میری عزت بڑھ گئی۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں کبھی کبھی اُس سے ملنے آجایا کروں۔ اُس نے مجھے دو تین دِن بعد آنے کو بھی کہا۔

میں چوتھے روز گیا تو اُس نے بتایا کہ جبّو کا ابھی کوئی سراغ نہیں مِلا۔ اب تین تھانے اُسے ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ جلدی مل جائے گا۔ تھانیدار نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جس تھانیدار کے علاقے میں عبدالقدیر کا گاؤں تھا، وہ تھانیدار رحیم کو کہیں ملا تھا۔ اُس نے بتایا کہ عبدالقدیر کی بیوی بَری ہو کر گھر گئی تھی۔ پولیس کی اس گھر پر نظر تھی مگر پندرہ سولہ دنوں بعد عبدالقدیر کی بیوی کہیں غائب ہو گئی۔ پولیس نے اس عورت پر اس لئے نظر رکھی تھی [illegible] جبّو نے عبدالقدیر کے ساتھ

جو دوستی لگا رکھی تھی وہ اسی عورت کی خاطر ہو گی۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اب اُسے جبّو کا کوئی آدمی اپنے ساتھ لے گیا ہو گا۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئی تھی۔ وہاں جاتی بھی کیسے۔ وہ عبدالقدیر کے پیچھے گھر سے بھاگ آئی تھی۔

ایک رات جب سارا گاؤں سویا ہُوا تھا، میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کسی امید پر اور کچھ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ ہمارا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا جو ہمارے گھر مہمان آتا۔ باہر ایک آدمی کھڑا تھا۔ ایک تو اندھیرا تھا، دوسرے اُس نے چہرہ پگڑی کے پلّو میں چھپا رکھا تھا۔

"شامو!" — اُس نے کہا — "مَیں جبّو کا پیغام لایا ہوں۔ اُس نے کہا ہے کہ تم مرد نہیں ہو۔ اپنی جان بچانے کے لئے تم نے اپنے جگری یار کو پھنسایا۔ اب پولیس کی یاری چھوڑ دو اور اپنی بہن کو بھول جاؤ۔ سُنا ہے کہ تم تھانیدار کے ساتھ مل کر مجھے تلاش کرنے کی باتیں کر رہے ہو۔ اگر تم باز نہ آئے تو ایک صبح گھر سے نکلو گے تو اپنے دروازے پر اپنی بہن کا سر پڑا دیکھو گے۔ اس کے بعد تم خود بھی قتل ہو جاؤ گے۔"

میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ اندر چلے۔ وہ وہاں سے آیا تھا جہاں میری بہن تھی۔ میں نے جبّو کی دھمکی کی پرواہ نہ کی۔ اپنی بہن کے متعلق پوچھنے لگا کہ وہ کیسی ہے۔ اس آدمی نے اندر آنے سے انکار کر دیا۔ میں رو پڑا اور اُس کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ مجھے بہن واپس دلا دے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گاؤں سے باہر لے گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے کیوں ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس آدمی کو مجھ پر رحم سا آگیا۔ کہنے لگا کہ میری بہن کو جبّو نے زبردستی نہیں رکھا، وہ اُس کے ساتھ خوش ہے، اور اُس نے میرے لئے یہ پیغام بھیجا ہے کہ وہ خوش ہے اور اُس کے لئے مَیں اور ماں باپ پریشان نہ ہوں۔

مَیں نے اس آدمی سے کہا کہ مجھے جبّو تک اپنے ساتھ لے چلے مگر اُس نے انکار کر دیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ میرے ساتھ اس لئے ناراض ہو گئی تھی کہ میں نے ڈکیتی کی واردات کی تھی، وہ جبّو کے ساتھ کیسے خوش

رہ سکتی ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ جبّو کا خاص آدمی ہے اور اُسے سب کچھ معلوم ہے۔ اُس نے بتایا کہ میری بہن نے جبّو سے کئی بار کہا تھا کہ وہ ڈاکہ زنی کا پیشہ چھوڑ دے۔ جبّو نے اُسے بتایا کہ وہ بڑے بڑے دولت مندوں کو لُوٹتا ہے اور حاجت مند لوگوں کی مدد امداد کرتا ہے۔ اُس نے میری بہن سے یہ بھی کہا کہ شاہ صاحب تھانیدار اُس کی عزت کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ اس قسم کے تھانیداروں کا دشمن ہے۔ اس طرح جبّو نے میری بہن کے ساتھ امیری غریبی، ظلم اور مظلوم، انصاف اور بے انصافی کی ایسی باتیں کیں کہ میری بہن جو چوری ڈاکے کو نفرت سے دیکھتی تھی، جبّو کی مرید بن گئی اور اُس نے جبّو سے یہ بھی کہا کہ کسی غریب اور بے آسرا لڑکی کی عزت بچانے کے لئے وہ مردوں کی طرح جبّو کا ساتھ دے گی۔

"میں تمہیں ایک اور بات نہیں بتانا چاہتا تھا" — اُس نے کہا —

"تمہاری بہن نے جبّو سے کہا تھا کہ میرے بھائی شامُو کو بھی اپنے پاس بلا لو، لیکن جبّو نے اُسے کہا کہ تمہارا بھائی غصے میں ایک واردات کر بیٹھا تھا، وہ اس کام کے قابل نہیں۔ وہ سب کو پھنسا دے گا۔"

وہ آدمی جانے لگا تو میں نے اُسے کہا کہ جبّو سے کہنا کہ میں تمہیں صرف اپنی بہن کے لئے تلاش کر رہا ہوں۔ تم تو کہتے ہو کہ تم غریبوں اور بے آسرا لوگوں کے مددگار ہو مگر تم نے میری وہ ساری دولت لُوٹ لی ہے جس کی خاطر میں اپنی جان تک دینے کو تیار ہوں۔ میری بہن ہی میرا خزانہ تھی۔ تم نے ایک غریب اور بے آسرا آدمی کو لُوٹ لیا ہے۔ تم میں اور شاہ تھانیدار میں کیا فرق رہ گیا ہے۔ میں نے اور میرے ماں باپ نے پیٹ کاٹ کر اپنی بہن کے لئے زیور اور کپڑے بنائے تھے۔ ہم اُسے عزت سے رُخصت کرتے۔ اب تو ہم کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔

یہ کہتے کہتے مجھے غصّہ آگیا۔ میں نے کہا — "جبّو سے کہنا کہ اپنی بہن کو واپس لانے کے لئے میں تمہیں قتل بھی کر سکتا ہوں۔ تم دوستوں کی طرح میری بات مان جاؤ۔ تم مجھے بُزدل سمجھتے ہو۔"

وہ آدمی ہنستا ہُوا چلا گیا اور میں سوچوں میں ڈوب گیا۔ یہ آدمی کیوں آیا تھا؟ دھمکی دینے یا میری بہن کا پیغام دینے؟ یا یہ دیکھنے آیا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا میں جبّو کے گروہ میں شامل ہو جاؤں گا؟ ایک سوچ یہ بھی تھی کہ میں جبّو کے ساتھ مل کر ڈاکو بن جاؤں؟

اشرف بیٹا! میں نے تمہیں کہانی سُنانے سے پہلے کہا تھا کہ ہتھکڑیاں اور جیل خانے کسی مُجرم کو جُرم سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح کوئی مُجرم کسی نیک پاک آدمی کو مُجرم نہیں بنا سکتا۔ یہ حالات ہوتے ہیں جو انسان کو مُجرم بناتے ہیں بلکہ یہ کہہ لو کہ انسان بعض انسانوں کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ جُرم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تم "حکایت" میں جیدے جیب کُترے کی کہانی پڑھ رہے ہو۔ اُس کے ساتھیوں کی باتیں بھی پڑھ رہے ہو۔ نوعمر لڑکوں کی باتیں بھی اس ناول میں پڑھ رہے ہو۔ یہ سب مُجرم پیدا نہیں ہوتے تھے۔ انہیں لوگوں کے ظُلم، بے انصافی اور حق تلفی نے مُجرم بنایا تھا۔

میں ایک تھانیدار کے ظلم اور بے انصافی سے مُجرم بنا۔ میں اس کے سوا اُس کے خلاف اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب میری بہن مجھ سے چھن گئی تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جبّو کے پاس چلا جاؤں اور ڈاکو بن جاؤں۔ مجھ میں ایمان کی روشنی موجود تھی۔ میں تھانیدار رحیم کے پاس چلا گیا اور اُسے جبّو کے اس آدمی کی ساری باتیں سُنائیں اور یہ بھی بتایا کہ میں جبّو کے پاس جانے کی سوچ رہا ہوں۔

میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ تھانیدار نیک انسان تھا بلکہ وہ تھانیدار اس لئے لگتا تھا کہ تھانیداروں کی وردی پہنتا تھا۔ اُس نے مجھے جبّو کے پاس جانے سے روکا اور کہا کہ ایک طرف تمہارا ایمان ہے اور دوسری طرف تمہاری وہ بہن ہے جس نے ایک ڈاکو کے ساتھ دل لگا لیا ہے اور جبّو سے کہتی ہے کہ میرے بھائی کو بھی ڈاکو بنا لو۔ تم خود سوچو کہ تم ایمان کو قائم رکھو گے یا اس بہن کی عزت کو عزیز سمجھو گے؟

اُس نے ایسی باتیں کیں کہ میں گمراہ نہ ہُوا مگر دل کی بے چینی نہ گئی۔

میں نے باقاعدہ نماز پڑھنی شروع کر دی اور ہر نماز کے بعد جب میں دعا مانگتا تھا تو اکثر میرے آنسو نکل آتے تھے۔ ایک رات خواب میں بہن کو دیکھا۔ میں چھت پر کھڑا تھا۔ نیچے دیکھا۔ میری بہن دروازے پر کھڑی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا اندر آجاؤ۔ اُس نے کہا میرے لئے دروازہ اب کبھی نہیں کھلے گا۔ میں نے اپنے لئے عزت اور آبرو کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ میں نے کہا عزت مل جائے گی۔ دروازہ کھول لو۔ پھر ایسے ہُوا کہ دروازہ اُس نے نہیں کھولا۔ میں اُوپر تھا۔ میں نے بھی نہیں کھولا۔ کسی اور نے بھی نہیں کھولا۔ دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میری بہن اندر آگئی۔ میں نے خوشی سے چھت سے چھلانگ لگا دی اور آنکھ کھل گئی۔ میں ایسے محسوس کرنے لگا کہ میری بہن آجائے گی اور خُدا نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی میری دعائیں قبول کر لی ہیں۔

اس کے بعد شاید ایک ہی مہینہ گزرا ہوگا کہ جبّو کا وہی آدمی پھر آگیا۔ وقت رات کا تھا۔ اُس نے جبّو کا یہ پیغام دیا کہ مجھے قتل کرنا چاہو تو اس آدمی کے ساتھ آجاؤ۔ جو ہتھیار لانا چاہو لے آنا۔ بہن تمہیں پھر بھی نہیں ملے گی۔ اگر میرے پاس ہمیشہ کے لئے آنا چاہو تو بھائی سمجھ کر ساتھ رکھوں گا۔ بہن تمہیں پھر بھی نہیں ملے گی۔ میں تمہاری ایک خواہش پوری کر رہا ہوں وہ ہے تمہاری بہن کی شادی۔ میں نے ابھی تک اُس کے ساتھ شادی نہیں کی لیکن اللہ گواہ ہے کہ اسے داشتہ اور بے نکاحی بیوی بھی نہیں بنایا۔ اس لڑکی کے ساتھ مجھے اتنا پیار ہے کہ اسے بڑی پاک چیز سمجھ کے رکھا ہُوا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ جاؤ اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤ۔ اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے بھائی کو اپنے پاس بلا لو۔

جبّو نے دوسرا پیغام یہ بھیجا کہ تمہاری خواہش تھی کہ اپنی بہن کی شادی کرو۔ میں اُس کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔ اُس وقت تک اُس کا جسم مجھ پر حرام ہے۔ غریب کی بیٹی جبّو کے ہاتھوں بے آبرو نہیں ہوگی۔ شادی کے بعد تمہیں کہیں بلاؤں گا یا خود آجاؤں گا۔ تمہاری بہن ساتھ ہوگی۔ اس

سے پوچھ لینا کہ وہ میری داشتہ ہے یا بیوی۔ اگر تمہیں یا تمہارے ماں باپ کو پولیس پریشان کرتی ہو تو مجھے بتاؤ۔ تھانے کو آگ لگا دوں گا۔

پیغام لانے والا آدمی چلا گیا اور میں نہ جانے کتنی دیر باہر اندھیرے میں کھڑا رہا۔ میری حالت اب پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ اگر میں بزدل اور بے غیرت ہوتا تو اپنے آپ کو کوئی نہ کوئی دھوکہ دے کر گھر بیٹھ رہتا۔ جبّو کو میں ایسا دشمن سمجھنے لگا جسے قتل کرنا میرے لئے مذہبی فرض بن گیا۔ اپنی بہن کے خلاف بھی میرے دل میں غصہ پیدا ہو گیا۔ میں اُسے بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اُس کے مل جانے کی صورت میں صرف یہ یقین کرنا تھا کہ اُس نے جبّو کے ساتھ واقعی شادی کر لی تھی اور شادی سے پہلے وہ اُس کی داشتہ نہیں بنی تھی۔

بار بار میرا دھیان تھانیدار رحیم کی طرف جاتا تھا مگر وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا، سوائے اس کے کہ وہ مجھے جبّو کا ساتھی بننے یا اُسے قتل کرنے سے روکتا تھا اور تسلّی دیتا تھا کہ جبّو کی تلاش جاری ہے۔ وہ مل گیا تو مجھے بہن بھی مل جائے گی۔ مجھے دراصل آسرا تو خُدا کا تھا۔ اس کی ذات کے حضور روتا اور رو رو کر دعائیں مانگتا تھا۔

مددگار اللہ ہی ہوتا ہے اور اللہ نے ہی میری مدد کی۔ جبّو کا آدمی جس رات دوسری بار آیا تھا، اس کے تیسرے یا چوتھے روز مجھے تھانے سے بلاوا آیا۔ تھانیدار رحیم نے بلایا تھا۔ میں فوراً گیا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہاں میری بہن بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اسے خواب سمجھا اور تھانیدار کے دفتر کے دروازے پر ہی رُک گیا۔ بہن بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے آنسو نکل آئے۔ وہ اٹھی اور میرے قدموں میں بیٹھ کر اُس نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے پھر میرے دونوں پاؤں کے درمیان ماتھا رکھ دیا۔ میں حیران اور پریشان کھڑا رہا۔ وہ اُٹھی اور اُس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے میرا ایک گال چوما پھر دوسرا اور خاموشی سے جا کر بنچ پر بیٹھ گئی۔

وہ میری بہن تھی۔ اُس کے آنسوؤں نے میرا غصّہ ٹھنڈا کر دیا۔ اُس نے میرے قدموں میں سجدہ کیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ گناہگار بندوں کو خُدا بھی معاف کر دیا کرتا ہے، میں تو گناہگار بندہ ہوں۔ میں نے دل میں اپنی بہن کو معاف کر دیا۔

میں نے دیکھا کہ تھانیدار رحیم کے پاس ایک اور تھانیدار بیٹھا ہُوا تھا وہ بھی مسلمان تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ تھانیدار رحیم نے اُس تھانیدار کو میرے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا، اس لئے میرے ساتھ اور میری بہن کے ساتھ اُس کا رویّہ بڑا اچھا تھا۔ میری بہن کے ساتھ اُس کا رویّہ اچھا نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ وہ ملزم تھی اور وہ جبّو کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔ جبّو بھی پکڑا گیا تھا۔ یہ تھانیدار بارہ میل دُور کے تھانے سے آیا تھا۔ میری بہن نے گرفتاری پر اُسے اپنے گاؤں کا اور میرا نام بتایا تھا۔ یہ تھانیدار اُسے ہمارے تھانے میں اس تصدیق کے لئے لایا تھا کہ وہ واقعی اسی گاؤں کی رہنے والی ہے اور میں اُس کا بھائی ہوں۔ میری بہن کے متعلق اُسے تھانیدار رحیم سے اور اس تھانے کے کاغذات سے بھی کچھ معلوم کرنا تھا۔

یہ قصّہ یوں تھا کہ اس تھانیدار کے تھانے کے علاقے میں چند ایک گھروں کا چھوٹا سا ایک گاؤں تھا جس کا شاید کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اُس زمانے میں وہ جنگل اور مٹی کے ٹیلوں اور گھاٹیوں کا علاقہ تھا۔ اُس تھانیدار کو اطلاع ملی کہ فلاں رات جبّو اس گاؤں میں شادی رچا رہا ہے۔ وہ اپنے پیغام کے مطابق میری بہن کے ساتھ اس گاؤں میں جا کر شادی کرنے والا تھا۔ میں نے شاید تمہیں بتایا ہے کہ دیہات کے لوگ نامی گرامی ڈاکوؤں کی مدد کیا کرتے تھے اور انہیں پناہ دیتے تھے۔ اس کے عوض ڈاکو اُن کے مالی اور دوسرے مسئلے حل کر دیا کرتے تھے۔ وہ صرف ساہوکاروں کو اور تاجروں کے قافلوں کو لُوٹا کرتے تھے۔

جبّو نے شادی کے لئے اس گاؤں کو شاید اس لئے پسند کیا تھا کہ وہ عام راستوں اور بڑی بستیوں سے الگ تھلگ اور دشوار گزار علاقے میں

تھا۔ وہاں سب مسلمان رہتے تھے۔ نکاح پڑھنے کے لئے وہاں مولوی بھی تھا۔ شاید کچھ اور وجہ بھی ہو۔

شادی رات کو ہونی تھی۔ جبّو کے گروہ کے آدمی وہاں موجود تھے۔ گاؤں کی عورتیں بھی شادی کے جشن میں شریک تھیں۔ گانا بجانا ہو رہا تھا۔ جبّو کے آدمی شراب کے نشے میں بھنگڑا ناچ رہے تھے۔ میری بہن کو گاؤں کی عورتوں نے دلہن بنایا تھا۔ نکاح پڑھا جا چکا تھا اور کھانے، پینے اور اُودھم مچانے کا دَور شروع تھا۔

بیس بائیس غریب سے دیہاتی دس بارہ اونٹوں کے ساتھ گاؤں میں جا رُکے اور جشن کا تماشہ دیکھنے لگے۔ اُن سے پُوچھا گیا کہ وہ کون ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جالندھر کے ایک تاجر کا مال لے جا رہے ہیں اور رات یہاں رُکیں گے۔ جبّو نے حکم دیا کہ ان سب کو کھانا کھلاؤ، یہ میری شادی میں شریک ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے کہا کہ ان کے اونٹوں پر جو مال ہے وہ اُتار لو اور اونٹ انہیں دے دینا۔ اُونٹ ان کے اپنے ہیں۔

اُونٹ قریب ہی کھڑے تھے۔ ایک نے کہا ___ "ہم اُونٹوں کو بٹھا دیتے ہیں۔ تم مال اُتار لو۔ ہم جا کر کہہ دیں گے کہ لُوٹے گئے ہیں۔ ہمیں ہمارے اُونٹ چاہیئں۔"

اُونٹ اندھیرے میں تھے۔ وہ سب اُونٹوں کو بٹھانے لگے۔ ان پر بہت تھوڑا سا سامان لدا ہُوا تھا۔ ان لوگوں نے یہ سامان کھولا تو اندر سے رائفلیں نکلیں۔ جتنے آدمی تھے اتنی ہی رائفلیں تھیں اور چمڑے کی پیٹیاں تھیں جن میں ایمونیشن کے چار چار پَوچ تھے۔ ان "شتربانوں" نے ایک ایک رائفل اور ایک ایک پیٹی (بیلٹ) اُٹھالی۔ پیٹیاں کمر سے باندھ لیں۔ یہ اُس زمانے میں پولیس والوں کے پاس ہوتی تھیں۔ رائفلوں میں راؤنڈ تھے۔

جبّو کے آدمی شراب میں بدمست شادی کا جشن منا رہے تھے۔ اب اور زیادہ خوش تھے کہ شکار گھر آ گیا ہے۔ اتنے میں بڑی بلند آواز آئی ___ "جبّو! جہاں ہو وہیں رہو۔ ذرا سا ہلے تو میرے ریوالور کی شست میں ہو"___

دوسری آواز گرجی ـــ "سب جہاں کھڑے ہو وہاں بیٹھ جاؤ۔"

جشن کے اودھم پر سناٹا طاری ہوگیا۔ جشن بیس بائیس رائفلوں اور ایک ریوالور کے نرغے میں تھا اور یہ گرجدار للکار اس تھانیدار کی تھی جو مصنوعی داڑھی لگائے ہوئے تھا اور اُس کے کپڑے عجیب سے شتربانوں جیسے تھے۔ جبّو کے پاس میری بہن دُلہن بنی بیٹھی تھی۔ جبّو گھیرے میں سے نکلنے کا اور پولیس مقابلے کا ماہر تھا لیکن وہ بے خبری میں پکڑا گیا تھا اور وہ خالی ہاتھ بھی تھا۔

ہر کوئی جہاں تھا وہیں بُت بن گیا۔ اس تھانیدار نے (میں نام بالکل ہی بھول گیا ہوں) بتایا کہ اُس کے دائیں طرف ایک آدمی نے ذرا سی حرکت کی۔ وہ شاید اپنے کپڑوں کے اندر سے خنجر یا چاقو نکالنے لگا تھا یا شاید اُس نے کھجلانے کے لئے ہاتھ پیٹ کی طرف کیا ہو۔ اُس نے جونہی حرکت کی، تھانیدار کا ریوالور چلا اور وہ آدمی اپنے ایک بازو پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ گولی اُس کے کندھے اور کہنی کے درمیان بازو پر لگی تھی۔ وہ مرنے سے بچ گیا۔

تھانیدار نے اعلان کیا کہ گاؤں کے آدمی اور عورتیں ایک طرف ہٹ جائیں اور جبّو کے آدمی یہیں کھڑے رہیں۔ سات آٹھ آدمی وہیں کھڑے رہے، باقی سب وہاں سے ہٹ گئے۔ کچھ لوگ پرے سے ہو کر بھاگ اُٹھے لیکن پولیس نے اُن کی طرف توجہ نہ دی۔ اس طرح جبّو کے کچھ ساتھی بھاگ گئے ہوں گے لیکن جبّو کے لئے بھاگنا ممکن نہیں تھا۔ اُس نے تھانیدار سے کہا ـــ "انشاء اللہ جیل سے بھاگوں گا۔"

جبّو کے ساتھ میری بہن بھی پکڑی گئی۔ اُس سے بیان لیا گیا۔ اُس نے اپنے گاؤں کا اور میرا نام لیا اور کہا کہ وہ جبّو کے ساتھ اپنی مرضی سے آئی ہے۔

اب وہ میرے سامنے تھانے میں بیٹھی تھی۔ یہ تو ثابت ہو گیا کہ میری بہن اور جبّو کا ساتھ اتنا پرانا نہیں کہ وہ جبّو کے رازوں سے واقف ہوتی

اور بتا سکتی کہ جبّو نے لُوٹ مار کا مال کہاں رکھا ہُوا ہے۔ ابھی اُسے دو مہینے پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس عرصے کے متعلق اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ جبّو نے کہیں کوئی واردات کی ہے یا نہیں، لیکن تھانیدار جس کے ساتھ وہ آئی تھی اور تھانیدار رحیم بھی کہتا تھا کہ میری بہن یہ بیان دے کہ جبّو نے اُسے اغوا کیا تھا اور زبردستی اُسے داشتہ بنائے رکھا اور اب زبردستی اُس کے ساتھ شادی کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی دونوں تھانیدار اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لئے میری بہن سے اپنی مرضی کا بیان دلانا چاہتے تھے۔

میں نے کہا کہ ہاں ہاں، آپ جو کہیں گے میری بہن عدالت میں وہی بیان دے گی۔

"میں جو کچھ کہہ چکی ہوں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گی" ـــ میری بہن نے کہا ـــ "میں جھُوٹ نہیں بولوں گی۔"

مجھے ڈر تھا کہ دوسرے تھانے کا تھانیدار میری بہن کو ڈرانے کے لئے حوالات میں بند کر دے گا اور اگر میری بہن نے اُس کی مرضی کا بیان نہ دیا تو تھانیدار اسے بھی سزا دلا دے گا، لیکن تھانیدار رحیم نے ہماری بہت سفارش کی۔ دوسرا تھانیدار اُسے فوراً چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس نے تھانیدار رحیم کے کہنے پر مجھے یہ اجازت دے دی کہ میں اُس کے تھانے میں چلا چلوں اور اپنی بہن کے ساتھ رہوں۔

میں ساتھ چلا گیا۔ تھانیدار نے مجھے تھانے کے احاطے میں رہنے کو جگہ دے دی۔ میری بہن کو حوالات میں رکھا گیا۔ وہاں مجھے پتہ چلا کہ یہ تھانیدار مجھ پر کیوں مہربان ہو گیا ہے۔ وہ مجھے بار بار کہتا تھا کہ میں اپنی بہن کو اُس کی مرضی کا بیان دینے پر رضامند کر دوں۔ وہ میری بہن کو میرے پاس بٹھا دیتا تھا اور میں بہن سے کہتا تھا کہ اگر اُس نے بیان نہ دیا تو اُسے سزا مل جائے گی مگر وہ نہ مانی۔ اُس کی زبان پر بھی ایک جواب تھا ـــ "اگر مجھے کچھ معلوم ہوتا تو بھی جبّو کے خلاف کوئی بیان نہ دیتی۔"

میں کیسے مان سکتا تھا کہ جبّو نے اسے بہن یا بیٹی بنا کر رکھا ہوگا۔

"اللہ گواہ ہے کہ میں کنواری ہوں"۔۔۔ میری بہن نے کہا ۔۔۔"وہ ڈاکو ہے۔ میں یہی سمجھتی تھی جو تم سمجھ رہے ہو۔ ایک ڈاکو سے تم اور کیا اُمید رکھ سکتے ہو مگر اُس نے مجھے پہلے روز کہہ دیا تھا کہ تم مجھے اتنی اچھی لگتی ہو کہ تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ وہ بھی مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں اُس کے ساتھ جا کر بہت خوش ہوئی۔ اُس نے جب مجھے کہا کہ شادی کے بغیر تمہارا جسم مجھ پر حرام ہے تو میں اُسے فرشتہ سمجھنے لگی۔"

جبّو اور اُس کے سات آٹھ ساتھی اسی حوالات میں بند تھے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ حوالات برآمدے میں ہی تھی۔ جبّو نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ بہت دلیر آدمی تھا۔ عقلمند بھی تھا۔

"شامو!"۔۔۔ اُس نے سلاخوں والے بند دروازے میں سے بلند آواز سے کہا۔۔۔"اپنی بہن کو اُلٹے سیدھے بیان پڑھانے آئے ہو؟ پہلے اپنی بہن سے پوچھ لینا کہ میں لے اسے کس طرح اپنے پاس رکھا تھا۔ اگر تمہیں یقین آجائے تو بے غیرتوں والا کام نہ خود کرنا نہ بہن سے کرانا۔"

مجھے یقین آگیا کہ میری بہن اور جبّو سچے ہیں۔ میں نے تھانیدار سے کہا کہ میری بہن کوئی جھوٹا بیان نہیں دے گی۔ تھانیدار کے پاس چھوٹا تھانیدار (اے۔ ایس۔ آئی) بیٹھا تھا۔ اُس نے تھانیدار سے کہا کہ وہ میری بہن سے اپنی مرضی کا کوئی بیان نہ دلائے کیونکہ خطرہ ہے کہ عدالت میں جا کر کوئی ایسی بات کہہ دے گی جو سارے مقدمے کو خراب کر دے گی اور یہ لڑکی وکیلوں کی جرح میں کچھ اور بک ڈالے گی۔ سرکاری وکیل خود ہی اس سے اپنے مطلب کی باتیں کہلوا لے گا۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ کیسے ہُوا کہ میری بہن کو مجسٹریٹ کے سامنے لے گئے اور اُسے رہا کر دیا گیا لیکن میری ضمانت لی گئی کہ میں اسے عدالت میں گواہ کے طور پر پیش کرتا رہوں گا۔ میری بہن نے خود ہی کہا کہ اُسے جب بھی بلایا جائیگا وہ آجایا کرے گی لیکن بیان وہی دے گی جو وہ دے چکی ہے۔

جالندھر میں مقدمہ چلا۔ میں بہن کو ساتھ لے کر جالندھر جایا کرتا تھا۔ جبّو کے خلاف تین قتل کی اور پانچ ڈکیتی کی وارداتوں کا الزام تھا۔ مقدمہ شروع ہُوا تو میں نے عبدالقدیر کی بیوی کو دیکھا۔ وہ ایک آدمی کے ساتھ جالندھر عدالت میں گواہی دینے آئی تھی۔ وہ مجھے اور میری بہن کو گھُور گھُور کر دیکھتی تھی۔ ہم سے سخت ناراض تھی۔ میں عدالت میں گواہوں کے بیان سُنا کرتا تھا۔ جبّو کے خلاف تین تھانوں کے کیس تھے اس لئے گواہ بہت سے تھے۔ اُس کی وارداتوں کو جانے دو۔ میں تمہیں سُناتا ہوں کہ جبّو کی نشاندہی کس طرح ہوئی تھی۔

جبّو کو پکڑوانے والی عبدالقدیر کی بیوی تھی۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ خوبصورت اور جوان تھی۔ عبدالقدیر کو سزا ہوگئی تو جبّو نے دوستی کا حق ادا کرنے کے لئے اُس کی بیوی کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ باتیں جو میں سُنانے لگا ہوں، اُس آدمی کے بیان سے معلوم ہوئی تھیں جو عبدالقدیر کی بیوی کے ساتھ تھا۔ خوبصورت بیان تھا۔ اسے پولیس نے وعدہ معاف گواہ بنا لیا تھا۔ ہُوا یوں کہ عبدالقدیر کی بیوی جبّو کے پاس پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ جبّو میری بہن کو بڑے پیار سے اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ عبدالقدیر کی بیوی کو پتہ چلا کہ جبّو میری بہن کے ساتھ شادی کر رہا ہے تو اُس میں حسد پیدا ہوگیا۔ اُس نے جبّو پر اپنا جادو چلانے کی کوشش شروع کر دی لیکن جبّو اُسے اپنے دوست کی بیوی سمجھتے ہوئے اُس کی خواہش پوری نہیں کر رہا تھا۔

یہ آدمی جو عبدالقدیر کی بیوی کے ساتھ عدالت میں آیا کرتا تھا، اُسے دل سے چاہنے لگا۔ وہ جبّو کا خاص آدمی تھا۔ اُس کے بیان سے پتہ چلا کہ دو بار یہی میرے گھر مجھے جبّو کا پیغام دینے آیا تھا۔ اس نے عبدالقدیر کی بیوی سے محبت کا اظہار کیا جو اس عورت نے قبول نہ کیا۔ وہ جبّو کی داشتہ بننے کی کوشش کر رہی تھی مگر جبّو اس امانت میں خیانت نہیں کر رہا تھا۔ آخر ایک روز تنگ آکر عبدالقدیر کی بیوی نے جبّو سے اپنی محبت اور

خواہش کا اظہار کر دیا۔ جبّو نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ اس چوٹ کو برداشت نہ کر سکی۔

جبّو کا یہ خاص آدمی کوئی شریف آدمی تو نہیں تھا۔ اُس نے عبدالقدیر کی بیوی پر اپنا جادو چلا لیا۔ جبّو کو علم ہو گیا۔ اُس نے اپنے اس آدمی کی بہت بے عزتی کی۔ اتنے میں جبّو نے چھوٹے سے ایک گاؤں میں جا کر شادی کا جشن منانے کا اعلان کیا۔ عبدالقدیر کی بیوی جل بھُن گئی۔ اُس نے میری بہن سے کچھ کہا تو میری بہن نے اسے ایسا طعنہ دیا جو کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی۔ اُس نے جبّو کے اس خاص آدمی سے کہا کہ وہ اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پولیس کو اطلاع دی جائے کہ فلاں رات جبّو فلاں جگہ ہو گا۔ جبّو کا یہ آدمی بھی غصے میں تھا۔ جبّو نے اس کی بے عزتی کی تھی۔ میری بہن نے عبدالقدیر کی بیوی کو جو طعنہ دیا تھا، اس میں اس آدمی کا حوالہ بھی تھا، اس لئے یہ شخص میری بہن کے لئے پریشانی بلکہ ذلت پیدا کرنا چاہتا تھا۔

شادی سے دو تین روز پہلے یہ آدمی جبّو کا پیغام لے کر میرے پاس آیا تو اُس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس علاقے کے تھانیدار کو اطلاع دے دی جس علاقے میں وہ گاؤں تھا۔ شادی کی رات یہ آدمی اور عبدالقدیر کی بیوی شادی میں شریک تھے لیکن پولیس کے آنے سے ذرا پہلے اندھیرے میں کھسک گئے۔ وہ پولیس کو راستے میں ملے اور بتایا کہ شادی کا جشن زوروں پر ہے۔

پولیس کا چھاپہ کامیاب رہا۔ یہ آدمی اور عبدالقدیر کی بیوی تھانے جا بیٹھے اور پولیس کے گواہ بن گئے۔ مقدمے کا فیصلہ سیشن کورٹ نے کیا۔ جبّو کو سزائے موت سنائی گئی۔ اُس کے ساتھیوں کو دس سال سے لے کر عمر قید تک سزا دی گئی۔

اِدھر میری بہن کی حالت یہ ہو گئی کہ اُسے چُپ لگ گئی۔ بولتی نہیں تھی نہ کسی بات کا جواب دیتی تھی۔ یہ تو میرے لئے ساری عمر کی

مصیبت بن گئی تھی۔ سب کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے ساتھ رہی ہے اور اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اس کے علاوہ لوگوں نے اُسے خاموشی کی حالت میں دیکھا۔ مشہور ہو گیا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ اسے اب کوئی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میرے ماں باپ کو بیٹی کا روگ لگ گیا اور میری حالت دن بدن خراب ہونے لگی۔

چھ مہینے بعد بہن نے کچھ بولنا شروع کیا۔ اُس نے پہلی بات یہ کہی کہ شامو کا بیاہ کر دو۔ وہ پھر میرے پیچھے پڑ گئی کہ شادی کر دو۔ میں دراصل اُس کی شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتا تھا لیکن اُس کی ضد ایسی تھی کہ اُس کی خوشی کی خاطر میں نے شادی کر لی۔ جس لڑکی کے ساتھ میری منگنی ہوئی تھی، اُس کی شادی کہیں اور کر دی گئی تھی۔ ایک اور رشتہ مل گیا اور میری شادی ہو گئی لیکن بہن کا مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا۔ میرے ماں باپ نے دو تین لڑکوں کے والدین سے منت کی کہ وہ میری بہن کو قبول کر لیں مگر کسی نے بھی قبول نہ کیا۔

ساڑھے تین سال گزر گئے۔ میری بہن اب بولتی چالتی تھی۔ گھر کے اور کھیتی باڑی کے کام کرتی تھی اور اُس کی عمر بائیس سال ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں دیہات میں سولہ سترہ سال کی لڑکی کی شادی کر دیا کرتے تھے۔ مجھے اب یہی نظر آ رہا تھا کہ میری بہن کنواری بوڑھی ہو جائے گی۔ میرے ماں باپ خانقاہوں پر جاتے اور ماتھے رگڑتے تھے اور میں خُدا کے حضور روتا تھا۔

ایک روز عبدالقدیر میرے گھر آ گیا۔ اُسے دیکھ کر میں بہت حیران ہُوا۔ اُسے ایک جُرم کی سزا پانچ سال اور دوسرے کی دو سال ہوئی تھی۔ وہ ساڑھے تین پونے چار سال بعد کیسے آ گیا؟ میں نے اُس سے پُوچھا کہ جیل سے بھاگ آئے ہو؟ اُس نے بتایا کہ دونوں سزائیں اکٹھی شروع ہوئی تھیں۔ اس طرح اُسے سات کی بجائے پانچ سال قید کاٹنی تھی۔ جیل میں ہر سال قید میں سے کچھ معافی ملا کرتی ہے۔ عبدالقدیر نے جیل میں

اپنا چال چلن اچھا رکھا اس لئے اُسے معافی کچھ زیادہ ملی۔ اُسے کچھ اور معافی انعام کے طور پر ملی۔ دو بڑے خطرناک قیدیوں نے جیل کے ایک افسر پر حملہ کر دیا۔ عبدالقدیر نے دونوں کا مقابلہ کیا اور افسر کو بچا لیا۔ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس طرح اُس کی کل معافی ڈیڑھ سال بن گئی اور وہ رہا ہو کر آ گیا۔

اُس کے دل میں میرے خلاف گلے شکوے بھرے ہوئے تھے۔ اُسے سزا میں نے دلوائی تھی لیکن اُس کی بیوی نے اُس کے ساتھ جو بے وفائی کی تھی اس سے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔ اپنا غم لے کر میرے پاس آیا۔ جیل میں اُسے جبّو کے ساتھی ملے تھے۔ جبّو نہیں مل سکا تھا کیونکہ اُسے سزائے موت ملی تھی۔ اُسے پھانسی کی کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا، پھر اُسے پھانسی دے دی گئی تھی۔ جبّو کے جن ساتھیوں کو قید کی سزا ملی تھی، اُنہوں نے عبدالقدیر کو بتایا تھا کہ اُس کی بیوی نے کیا گُل کھلاتے ہیں۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد وہ اُسی آدمی کے ساتھ چلی گئی تھی۔

عبدالقدیر ان دونوں کو تلاش کر کے دونوں کو قتل کرنے کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اُسے اُسی طرح سمجھانا شروع کر دیا جس طرح تھانیدار رحیم نے مجھے جبّو کی تلاش اور قتل کے ارادے سے باز رکھا تھا۔ میں نے

عبدالقدیر کو تین چار روز اپنے گھر رکھا۔ اُسے بتایا کہ میری بہن کی ساری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ میرے آنسو نکل آئے۔ عبدالقدیر نے کہا کہ اگر وہ میری بہن کا رشتہ مانگے تو میں دے دُوں گا؟

مَیں نے جواب دینے کی بجائے اُسے گلے لگا لیا اور میں بہت رویا۔ یہ تو معجزہ تھا۔ خُدا نے میری فریادیں سُن لی تھیں۔ میں نے اپنی بہن کو اُس کے ساتھ بیاہ دیا۔ وہ دونوں اب دُنیا میں نہیں ہیں۔ اُن کی نشانی اُن کی اولاد ہے جو اولاد والی ہو گئی ہے۔

جب تیسرا بچّہ قتل ہُوا

راوی: رضی الدّین صدیقی
تحریر: حامد علی ناصر

محترم رضی الدّین صدیقی وسطی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ وہاں ان کا تعلق پولیس کے محکمے کے ساتھ تھا۔ اب اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں کہ ہاتھوں میں رعشہ ہے جو قلم پکڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ کہانی اُنہوں نے مجھے اس اجازت کے ساتھ سنائی ہے کہ قلمبند کر کے "حکایت" میں شائع کرا دوں۔ میں انہی کی زبان میں کہانی پیش کرتا ہوں۔

وسطی ہند میں سامٹن نام کا ایک انگریز ڈی۔ ایس۔ پی ہُوا کرتا تھا میں سروس کے آخری دنوں میں اس کا ایک قسم کا سیکرٹری تھا، زیادہ تر وقت اُس کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ جس علاقے میں تعینات تھا اس میں سیّد آباد نام کا ایک قصبہ تھا۔ اس کی آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ ایک روز سیّد آباد کے سرکردہ ہندوؤں کا ایک وفد سامٹن کے پاس آیا اور یہ رپورٹ پیش کی کہ قصبے کے ہندوؤں کے تین بچے چند مہینوں کے اندر لاپتہ ہو گئے ہیں تینوں کی عمر پانچ چھ سال تھی۔ گمشدگی کے چند روز بعد اُن کی لاشیں ملیں مگر لاشوں کے ساتھ سر نہیں تھے۔ پولیس کی کوششوں کے باوجود مُجرموں کا سراغ نہیں ملا۔ یہ وفد یہ درخواست لے کر آیا تھا کہ بچے تو قتل ہو چکے ہیں مُجرموں کو پکڑا جائے۔ وفد نے جو تفصیل سنائی اس کے مطابق کہانی یہ بنتی ہے کہ عرصہ نو ماہ پہلے ایک ہندو کا بچہ گلی میں کھیلتے کھیلتے لاپتہ ہو گیا۔ تلاشِ بسیار کے بعد تھانے میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ بچے کی عمر پانچ چھ سال تھی۔

تھانیدار ہندو تھا۔ اگر مسلمان ہوتا تو شک کیا جا سکتا تھا کہ اُس نے تعصب کی وجہ سے تفتیش صحیح نہیں کی۔ ہندو تھانیدار نے تفتیش میں بہت محنت کی۔ وہاں کے مشتبہ آدمیوں کو بھی مارا پیٹا۔ چھاپے بھی مارے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ چار پانچ دنوں بعد دیہاتیوں نے تھانے میں اطلاع دی کہ قصبے سے تھوڑی دُور ایک بچّے کی لاش پڑی ہے جسے گِدھ کھا رہے ہیں۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ لاش کے ساتھ اُس کا سر نہیں ہے۔ تھانیدار فوراً پہنچا۔ لاش کی شناخت ناممکن تھی کیونکہ سر جسم کے ساتھ نہیں تھا۔ جسم کی حالت یہ تھی کہ ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ کہیں کہیں گوشت کا تھوڑا تھوڑا سا ٹکڑا رہ گیا تھا۔ لاش سے دُور ہی ایک گڑھا تھا۔ اس کے ارد گرد پنجوں کے نشان بتاتے تھے کہ یہ بھیڑیوں کے ہیں۔ گڑھے سے لاش بھیڑیوں نے ہی نکالی تھی۔ وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ اس سے یہ ثبوت ملتا تھا کہ بچّے کو کہیں اور قتل کیا گیا ہے۔ گلا دبا کر مارا گیا ہوگا۔ سر کہیں اور کاٹا گیا اور جسم کو یہاں دفن کیا گیا۔ اگر سر درندے اُتارتے تو کھوپڑی وہاں موجود ہوتی۔ تھانیدار نے دُور دُور تک کھوپڑی تلاش کرائی۔ کہیں بھی نہ ملی۔ خیال یہ تھا کہ کوئی درندہ لے گیا ہوگا۔

وہاں جو پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے ان سے بچّے کے گھر والوں نے پہچانا کہ یہ انہی کے بچّے کی لاش ہے۔ تھانیدار نے تفتیش اور تیز کر دی لیکن مُجرم کا کوئی سراغ نہ ملا۔ دیہاتی علاقے کے جرائم پیشہ آدمیوں کو پکڑ کر انہیں بہت پریشان کیا گیا مگر تھانیدار ناکام رہا۔ بچّے کے باپ نے مجرم کو پکڑنے یا سراغ لگانے والے کے لئے نقد انعام کا اعلان کیا۔ اب تو شہری بھی مُخبری میں شامل ہو گئے مگر ہلکا سا کھوج بھی نہ ملا۔

تین مہینے گذر گئے۔ تفتیش جاری تھی۔ ایک رات ایک اور ہندو دھاڑیں مارتا تھانے میں داخل ہُوا۔ اُس نے رپورٹ درج کرائی کہ اُس کا بچّہ، عمر پانچ چھ سال، شام کے وقت کھیلنے کے لئے گھر سے نکلا پھر واپس نہیں آیا۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا، پڑوسیوں کے گھروں میں دیکھا، بچّہ کہیں بھی نہ ملا۔ تھانیدار نے شہر

کی ناکہ بندی کرا دی۔ مشکوک جگہوں پر چھاپے مارے۔ رات ہی رات مُخبروں کو گھروں سے جگا کر شہر میں پھیلا دیا۔ رات گذر گئی۔ بچّے کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تین چار دنوں بعد پھر وہی پہلے والی اطلاع ملی۔ قصبے سے ذرا دُور ایک بچّے کی لاش دیکھی گئی جسے گِدھ کھا رہے تھے۔ اس کا بھی سر غائب تھا۔ تھانیدار نے جا کر لاش دیکھی۔ اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اُسی لاش کو ایک بار پھر دیکھ رہا ہو جو اُس نے تین ماہ پہلے دیکھی تھی۔ درندے اور گِدھ گوشت پوست کھا گئے تھے۔ ہڈیوں کا پنجر باقی تھا جس کے ساتھ کہیں کہیں کھال یا بوٹی رہ گئی تھی۔ کپڑوں کے بکھرے ہوئے چیتھڑوں سے والدین نے اپنے بچّے کو پہچانا۔ پہلی اور اِس واردات میں فرق صرف یہ تھا کہ پہلی لاش قصبے کے کسی اور طرف سے ملی تھی اور دوسری کسی اور طرف سے ملی۔

یہ لاش بھی پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجی گئی۔ پہلی بھی بھیجی گئی تھی۔ پوسٹمارٹم کیا ہونا تھا۔ صرف ڈاکٹری رائے لینی تھی۔ دونوں کے متعلق ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ گردنیں ایسے ہتھیار سے کاٹ کر جسم سے الگ کی گئی ہیں جس سے گردن کی ہڈی بھی کٹ گئی ہے یعنی جوڑ الگ نہیں ہُوا۔ خون کی غیر موجودگی کے متعلق ڈاکٹر نے رائے دی تھی کہ سر اُس وقت اُتارے گئے جب بچّے مُردہ ہو چکے تھے۔

قصبے میں دہشت پھیل گئی۔ لوگوں نے بچوں کا گھروں سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ راتوں کو بچوں کی سخت حفاظت ہونے لگی۔ مگر مصیبت تو تھانیدار کے لئے بن گئی جس کے سر پر پہلے بچّے کی تفتیش سوار تھی۔ تین مہینوں میں وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ دوسری واردات پہلی سے ذرا سی بھی مختلف نہیں تھی۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ کچھ بھی پتہ نہ چلا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اب کے دو تین ہندوؤں نے مُجرم کو پکڑنے یا سراغ لگانے والوں کے لئے انعام مقرر کیا۔ یہ رقم نو سَو روپے بنتی تھی جو آج کے دَور کے دس ہزار روپے کے برابر تھی۔ شہریوں نے اپنے اپنے ذرائع اور کوششوں سے سراغ

لگانے کی مہم شروع کر دی۔ اس مہم میں لوگوں نے سادھو مہنتوں اور پیروں فقیروں کو بھی شامل کر لیا۔ قصبے کے قریب ہندو سادھوؤں کا ڈیرہ تھا جسے وہ آشرم کہتے تھے۔ قصبے کے اندر جہاں پنڈت اور جوتشی تھے وہاں مسلمانوں کا ایک پیر اور ایک عامل بھی تھا۔

جب ان لوگوں کو سراغرسانی کی مہم میں شامل کیا گیا تو ہندو اور مسلمان اپنا اپنا مذہب بھول گئے۔ ہندوؤں نے اپنے پنڈتوں اور سادھوؤں سے بچوں کے قاتل کا پتہ معلوم کرنے کے لئے اُن کی فرمائشیں پوری کیں اور مسلمانوں کے پیر اور عامل کے پاس بھی گئے اور نذر و نیاز دے کر پوچھا کہ بچوں کا قاتل کون ہے۔ مسلمان بھی ڈرے ہوئے تھے۔ اُن کے بھی بچے اغوا اور قتل ہو سکتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے پیر اور عامل کی خاطر و مدارت کر کے التجا کی کہ وہ اُن کے بچوں کو اس درندے سے بچائیں جس کے متعلق کوئی جانتا ہی نہیں کہ وہ کون ہے، انسان ہے یا بھیڑیا۔ مسلمان جو بہت زیادہ ڈر گئے تھے وہ سادھوؤں اور پنڈتوں کے پاس بھی گئے۔ کیا پیر اور کیا پنڈت، لوگوں کی ڈھارس بندھانے کی بجائے انہیں یہ کہہ کر ڈراتے رہے کہ کوئی جن بھوت ہے، اور کسی پاپی کی بدروح بھی ہو سکتی ہے۔ پھر قصبے میں یہی بات پھیل گئی کہ یہاں کسی کی بدروح آگئی ہے جو اٹھارہ بچے کھا کر ٹلے گی۔ پیر اور پنڈت نے، سادھوؤں اور عامل نے بچوں کو اس بدروح سے بچانے کے لئے اپنے اپنے طریقے اختیار کئے اور لوگوں سے خوب پیسہ بٹورا۔

درندوں کو بھگانے کے لئے بھی جنتر منتر پڑھے گئے۔ پیر اور جامع مسجد کے خطیب نے چالیس چالیس رات کے چلّے بھی کاٹے۔ ہندوؤں نے مندر میں اور مسلمانوں نے خانقاہ پر دیگیں پکا کر غریبوں میں کھانا تقسیم کیا۔ اردگرد کا علاقہ کچھ پہاڑی سا تھا اور جنگل بھی تھا۔ رات کو بھیڑیوں کی ڈراؤنی آوازیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ان میں ایک آواز بہت ہی ڈراؤنی اور بھیڑیوں سے الگ تھلگ سنائی دیتی ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ آواز کون سے درندے کی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگوں کا وہم ہی ہو۔ انہیں اب

رات کی ہر آواز بہت ڈراؤنی اور عجیب لگنے لگی تھی۔ پیر، پنڈت، سادھوؤں اور عامل نے اُن کے خوف میں اضافہ کر دیا تھا۔

دوسرے بچے کے قتل کو دو مہینے گذر گئے۔ کوئی سراغ نہ ملا۔ تھانیدار کی تبدیلی ہو گئی۔ اُس کی جگہ نیا تھانیدار آگیا۔ وہ بھی ہندو تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ پہلے تھانیدار نے مل ملا کر سیّد آباد سے تبدیلی کرا لی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوا تھا تو صاف ظاہر ہے کہ اُس نے دو بچوں کے پُراسرار قتل کی تفتیش سے گلو خلاصی کرائی تھی۔ ان وارداتوں کی تفتیش نئے تھانیدار کے سپرد ہوئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک وفد اُسے ملا اور اپنے خوف کا اظہار کیا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ پیر اور پنڈت نے لوگوں کے خوف میں اضافہ کر دیا ہے تو اُس نے وفد سے کہا کہ وہ سب تعلیم یافتہ اور سرکردہ افراد ہیں، وہم کو قبول نہ کریں۔ وفد میں سے کسی نے بھی اس کی بات نہ مانی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ وفد نے اُسے خبردار کیا کہ اُس کا بھی بچہ ہے اس لئے اُسے اپنے ہی بچے کی خاطر تفتیش کے ساتھ ساتھ لوگوں کے بچوں کی حفاظت کا انتظام کرنا چاہئے۔ تھانیدار نے انہیں کہا کہ اس کے بچے کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

وہ تھانیدار تھا اور تھانیدار اپنے آپ کو دیوتا سمجھا کرتے تھے۔ سیّد آباد میں اُسے آئے دس بارہ دن ہی ہوتے تھے کہ اُس کا بچہ لاپتہ ہو گیا۔ اس بچے کی عمر پانچ چھ سال تھی۔ وہ تھانے کے احاطے کے اندر ہی کھیلا کرتا تھا۔ تھانیدار کا کوارٹر تھانے کے احاطے میں تھا۔ قصبے سے باہر کوئی میلہ سا لگا تھا۔ ایک کانسٹیبل تھانیدار کے کہنے پر بچے کو میلے پر لے گیا تھا۔ شام کو کانسٹیبل حیران و پریشان بچے کے بغیر واپس آیا اور تھانیدار کو بتایا کہ وہ بچے کو ایک جگہ کھڑا کر کے اُس کے لئے کوئی چیز خریدنے لگا۔ بعد میں دیکھا کہ بچہ وہاں نہیں ہے۔ صرف ایک آدمی نے اُسے بتایا کہ ایک آدمی اس بچے کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا گیا تھا۔ اُس آدمی کو شناخت نہ کیا جا سکا۔ یہ تھانیدار کا اپنا بچہ تھا۔ اُس نے کانسٹیبل کو حوالات میں

بند کر دیا۔ اُسے شک تھا کہ پہلے بچوں کے قتل میں بھی اس کانسٹیبل کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ تھانیدار نے اُسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اس سے اقبالِ جرم کرانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُس کا شک بے بنیاد تھا۔ وہ کانسٹیبل کو دراصل سزا دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے شہر کی ناکہ بندی کی اور جو کارروائی مناسب سمجھی کی مگر سات آٹھ دِنوں تک بچے کا کوئی سراغ نہ ملا۔

آخر بچے کا سراغ مل گیا مگر بچہ زندہ نہیں تھا۔ اُس کی لاش بالکل اُسی حالت میں ملی جس طرح پہلے دو بچوں کی ملی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ اور سر غائب۔ جہاں سے لاش ملی اُس جگہ کے قریب ایک گڑھا تھا۔ بھیڑیوں نے لاش اس میں سے نکالی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے متعلق بھی یہی لکھا کہ "گردن تیز دھار آلے سے کاٹ کر سر جسم سے الگ کیا گیا ہے۔ تھانیدار نے سیّد آباد اور اِردگرد کے دیہات میں قیامت بپا کر دی۔ اُس نے بعض شریف گھرانوں پر بھی چھاپے مارے۔ راہ جاتے لوگوں کو پکڑ کر وہ تھانے لے جاتا اور انہیں مشتبہ بٹھا کر پریشان کرتا۔ اپنا بچہ قتل ہو جانے سے اُس کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ قصبے کی آبادی پہلے ہی ڈری ہوئی تھی۔ اب وہ اس نئے تھانیدار سے بھی ڈرنے لگی۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ اس سے تنگ آکر سرکردہ ہندوؤں کا ایک وفد پولیس ہیڈ کوارٹر میں گیا جہاں کا بڑا افسر سائمن ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ وفد نے جہاں تین بچوں کے قتل کی پُراسرار وارداتیں سنائیں وہاں اس انگریز ڈی۔ ایس۔ پی کو یہ بھی بتایا کہ تھانیدار کے اپنے بچے کا قتل حیرت انگیز ہے، اس کی وجہ سے شہریوں کے ساتھ تھانیدار کا سلوک ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ وہ ہر شہری کو اپنے بچے کا قاتل سمجھتا ہے۔ وفد نے تحریری درخواست دی کہ بچوں کے قاتل یا قاتلوں کے پکڑنے کا بندوبست کیا جائے اور شہریوں کے بچوں کی سلامتی کے لئے کچھ کیا جائے۔

وہ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ انگریز فوری کارروائی کے قائل تھے۔

ایسی خوفناک وارداتوں کو تو انگریز نظر انداز کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سائمن نے اُسی وقت بذریعہ ٹیلی فون اپنے بالائی افسروں کو رپورٹ دے کر اجازت حاصل کر لی کہ وہ فوراً سیّد آباد چلا جائے اور جب تک وہ مناسب سمجھے سیّد آباد میں ہی رہے۔ اُس نے اپنے ضروری عملے کو فوری تیاری کا حکم دیا۔ میں بھی اس عملے میں شامل تھا۔ وہاں سے سیّد آباد چالیس میل دُور تھا۔ سورج غروب ہونے تک ہم سائمن کے ساتھ سیّد آباد کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچ چکے تھے۔ اُس زمانے میں کبھی کبھی کسی جنگل سے اس قسم کی رپورٹ آیا کرتی تھی کہ ایک دھاری دار شیر چند ایک انسانوں کو کھا گیا ہے۔ براہِ کرم اِردگرد کی آبادی کو اس آدم خور سے نجات دلائی جائے۔ اس کا بندوبست یہ کیا جاتا تھا کہ کسی انگریز شکاری کو دعوتِ شکار دی جاتی تھی۔ یہ ہوتا تو حادثہ تھا لیکن انگریز شکاریوں کے لئے تفریح کا ذریعہ بن جایا کرتا تھا۔

رات کو ریسٹ ہاؤس میں سائمن نے مجھے کہا کہ یہ بھی کسی آدم خور شیر یا بھیڑیئے کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ اُس نے کہا۔ "اگر ایسا ہی ہے تو میں خود شکار کے لئے جاؤں گا"۔ وہ اپنی شکاری رائفل اور بندوق ساتھ لے گیا تھا۔ رات کو ہی اُس نے تھانیدار کو تینوں بچوں کی گمشدگی اور تفتیش کے ریکارڈ کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں طلب کر لیا۔ ساتھ ہی پہلے دو بچوں کے باپوں کو بھی بلوا لیا۔ آدھی رات کے بعد تک وہ تھانیدار سے اور دوسروں سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ میں اُس کے ساتھ رہا کیونکہ ساتھ رہنا میری ڈیوٹی تھی۔ وہ مجھے جو لکھاتا تھا میں لکھ لیتا تھا۔ آخر اُس نے سب کو رخصت کر دیا۔ وہ اس قدر گہری سوچ میں ڈوب گیا جیسے سو گیا ہو۔ بہت دیر بعد اُس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا ــــ "یہ کوئی شیر یا بھیڑیا نہیں۔ مجھے ایک آدم خور انسان کا شکار کرنا ہے۔ تم نے کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جو ان تینوں وارداتوں میں مشترک ہے؟"

"تینوں مقتولین کی عمر ایک جیسی ہے"۔ میں نے جواب دیا ــــ "پانچ چھ سال، اور تینوں کی لاشیں ایک ہی جیسی حالت میں ملی ہیں۔ تینوں کے سر جسم سے جدا کئے گئے ہیں۔"

"اور تینوں بچے ایک ہی مذہب کے ہیں۔" سائمن نے کہا۔۔۔ "اور تینوں بچوں کے دائیں گال پہ آنکھ کے قریب ایک کالا تِل تھا۔"

اُس نے ابتدائی رپورٹیں میری طرف سرکادیں۔ بچے کی گمشدگی کی رپورٹ میں حتی الامکان مکمل حُلیہ اور شناختی نشان پڑھے تو ہر ایک میں دائیں گال پر کالا تِل نظر آیا۔

"تمہارا ملک افریقہ سے کم جاہل اور گنوار نہیں۔" سائمن نے کہا۔۔۔ "میں نے چھ سال افریقہ کے حبشیوں میں گزارے ہیں۔ وہاں ایک قتل تو اس لئے ہوتے ہیں کہ لوگ انسانی گوشت کھاتے ہیں اور دوسرے قتل ٹونے ٹوٹکے کے طور پر ہوتے ہیں۔ خاص قسم کی عمر اور حلیے کے انسانوں کو قتل کرکے اُن کی لاشوں کو عجیب وغریب طریقوں سے بدروحوں اور درندوں کو بھگانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ ظالمانہ طریقہ یہ ہے کہ کسی آدمی کو پکڑ کر اُسے قید میں رکھا جاتا ہے۔ اُسے خاص قسم کی خوراک کھلائی جاتی ہے۔ کالا علم جاننے والا عامل اُس پر کچھ پڑھتا اور پھونکتا رہتا ہے۔ چند دنوں بعد اُس کی کھال اس حالت میں اُتاری جاتی ہے کہ وہ پُوری طرح تندرست اور زندہ ہوتا ہے۔ کھال سر کی طرف سے اُتارنا شروع کرتے ہیں۔ اس کام کے وہاں ماہرین موجود ہیں ورنہ انسان کی کھال اُتارنا آسان نہیں ہوتا۔ اس میں شرط یہ ہے کہ کھال کہیں سے کٹ نہ جائے۔ میں نے ایسے آدمی دیکھے تھے جو سر سے پاؤں تک کھال اُتر جانے کے بعد بھی زندہ تھے۔ ان میں سے تین کو دیکھا جو باتیں بھی کرتے تھے۔ اگر تم کھال اُترے ہوئے انسان کو دیکھو تو بے ہوش ہو جاؤ۔ ہم نے مجرموں کو پکڑ کر سزائے موت دی۔ بعض کو عمر قید دی اور اُن علاقوں سے یہ بھیانک وارداتیں رکوائیں جو برطانیہ کی بادشاہی میں لے لئے گئے تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان بچوں کا قتل بھی کالے علم، جادو یا ٹونے وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ تینوں بچوں کا مذہب ایک، عمر ایک اور گال پر تِل ایک جیسا ہے۔"

سائمن افریقہ میں رہ آیا تھا۔ ہندوستان میں آتے ہوئے اُسے پانچ

سال گزر گئے تھے۔ اُردو نہایت اچھی بولتا تھا اور ہندوستان کے مختلف مذہبوں کے نظریات اور لوگوں کے توہمات سے پوری طرح واقف تھا۔ ان توہمات کی باریکیوں کو بھی وہ جانتا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی نفسیات کو بھی جان لیا تھا۔ وہ ہمارے تعصبات سے بھی واقف تھے۔ ہماری رسومات کے متعلق بھی جانتے تھے کہ اُن کی حقیقت کیا ہے۔ اُنہوں نے ہماری کمزوریوں اور خامیوں سے فائدہ اٹھا کر ہم پر حکومت کی تھی۔ سائمن بھی ہندوستانیوں کی رگوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اُس نے دوسرے دن صبح سویرے قصبے کے چند ایک ہندو اور پانچ سات مسلمان معززین کو ریسٹ ہاؤس میں بلایا اور اُن سے کہا۔۔۔ "ان بچوں کو کسی نے کسی خاص عمل کے لئے قتل کیا ہے۔ وہ بچوں کے صرف سر استعمال کرتا ہے۔ آپ لوگ اپنے پیروں فقیروں پنڈتوں، سنیاسیوں اور سادھوؤں پر نظر رکھیں۔ ان لوگوں کے پاس کوئی خدائی یا غیبی طاقت نہیں ہے۔"

ہندو اور مسلمان معززین نے سائمن کی بات کاٹ دی۔ مسلمانوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر لاحول پڑھی اور ہندوؤں نے ہاتھ جوڑ کر اپنے مذہب کے کچھ الفاظ کہے جو توبہ توبہ کے ہم معنی تھے۔ دونوں نے دبی دبی زبان میں احتجاج کیا۔ اُن کے جذبات مجروح ہو گئے تھے۔ مسلمان اپنے پیروں فقیروں کے خلاف اور ہندو اپنے سادھو مہنتوں اور پنڈتوں کے خلاف کوئی بات برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ سائمن کو ان کے ردِ عمل پر غصہ آگیا۔ اُس نے انہیں کہا کہ اگر اُنہوں نے اپنے خیالات بدلنے کی کوشش نہ کی تو ان کے کتنے اور بچے قتل ہوں گے۔ مگر ان لوگوں نے پھر بھی سائمن کی بات پر غور نہ کیا۔ ایک مسلمان نے کہہ دیا کہ پیر خدا کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

"تمہارے عقیدے افریقہ کے حبشیوں جیسے ہیں۔" سائمن نے کہا۔۔۔ "اُن کے بھی تمہاری طرح کے پیر اور پنڈت ہیں جنہوں نے اِن حبشیوں کو جانور بنا رکھا ہے۔ وہاں کالا جادو چلتا ہے۔ وہاں بھی لوگ تمہاری طرح قتل

کرتے اور قتل ہوتے ہیں۔ تم میں اور ان میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ انسان کا گوشت کھا جاتے ہیں جو تم نہیں کھاتے۔ میں ہندو مذہب کو بھی جانتا ہوں اور اسلام سے بھی واقف ہوں۔ دونوں مذہب یہ تعلیم دیتے ہیں کہ خدا اور انسان کا براہِ راست تعلق ہے، مگر تمہارے پیر، پنڈت، سادھو

اور عامل درمیان میں آ گئے۔ انہوں نے خدا اور انسان کا رشتہ توڑ دیا۔ انہوں نے تمہاری جہالت سے فائدہ اٹھایا اور تمہیں اور زیادہ جاہل بنا دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تم اپنے ملک پر حکومت کرنے کے قابل نہیں رہے۔ ہم اتنی دُور سے آکر یہاں حکومت کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم صرف مذہب کے پابند ہیں اور خدا کے سوا کسی سے دعا نہیں مانگتے۔ ہمارے دلوں میں کوئی جھوٹی عقیدت نہیں۔ ہم حقیقت کو دیکھا کرتے ہیں۔۔۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم آدھی دُنیا کے مالک ہیں۔"

ڈی۔ ایس۔ پی سائمن نے بڑا لمبا لیکچر دیا جس کا نہ ہندوؤں پر اثر ہُوا نہ مسلمانوں پر۔ اگر اثر ہُوا بھی، تو وہ اُلٹا تھا۔ سائمن اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے اُسے یقین ہو گیا تھا کہ تینوں بچے قتل کر کے ان کے سر کسی ٹونے یا پُراسرار عمل کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، اور قاتل سیّد آباد میں موجود ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ قاتل باہر کا بھی ہو سکتا ہے۔ اُس نے تسلیم نہیں کیا۔ کہنے لگا کہ وہ باہر کا ہوتا تو لاشیں سیّد آباد سے دُور دفن ہو جاتیں۔ اس نے پہلے تھانیدار کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا کہ اُس نے کھوجیوں کو استعمال نہیں کیا تھا۔ ایسے ویرانے میں جہاں لوگوں اور مویشیوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے وہاں پاؤں کے نشانات بہت دن محفوظ رہتے ہیں۔ پاؤں کے نشان پہچاننے والے کھوجی تو پاؤں کے ذرا سے نشان سے بھی سراغ لگا لیا کرتے تھے۔ اُس نے نئے تھانیدار کو الگ کر کے کچھ باتیں بتائیں۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کیسی ہدایات تھیں۔ تین چار مُخبروں کو بھی بلا کر علیحدگی میں کوئی خفیہ ہدایات دی گئیں۔

سائمن کے ذاتی سٹاف میں ایک تو میں ساتھ تھا، دوسرا سب انسپکٹر کیدار ناتھ اور تیسرا میری طرح ایک اور سویلین ڈینئیل نام کا اینگلو انڈین تھا۔ اگلے روز

کے لئے سائمن نے شکار پر جانے کا پروگرام بنایا۔ اُس نے مجھے، کیدار ناتھ اور ڈینئیل کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

صبح جب ہم اُس کے ساتھ شکار کو نکلے تو دو اور آدمی ساتھ ہو لئے۔ وہ اسی علاقے یا غالباً سیّد آباد کے ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کا ہمارے ساتھ تعارف نہیں کرایا گیا۔ آگے چل کر جب سائمن نے اُن کے ساتھ باتیں شروع کیں تو ہم سمجھ گئے کہ یہ سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی ہیں یا وہ خصوصی مُخبر جو پولیس کے محکمے کے ملازم ہوتے ہیں۔ ہم جنگل میں کچھ دُور نکل گئے۔ سائمن نے ان دو آدمیوں سے الگ لے جا کر بات چیت کی۔ پھر وہ پرندوں کا شکار کھیلتا رہا۔ ہم جب آرام کے لئے بیٹھے تو سائمن نے ان آدمیوں سے پوچھا کہ شہر میں پیر فقیر اور سادھو وغیرہ کہاں کہاں رہتے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں اور اُن کے متعلق لوگوں کے عقیدے کیا ہیں۔

اُنہوں نے پوری تفصیل سے رپورٹ دی جو مختصراً یُوں ہے کہ سیّد آباد کے اندر ایک تو مسلمانوں کا پیر تھا جو لوگوں کو تعویذ دیتا اور غیب کا حال بتایا کرتا تھا۔ اُس کے متعلق لوگوں کے عقیدے وہی تھے جو آپ آج کل بھی دیکھ رہے ہیں۔ وہ بھی اسی قسم کا پیر تھا۔ لوگ اُسے بہت مانتے تھے۔ ایک عامل بھی تھا۔ وہ جِن نکالتا تھا۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کے قبضے میں جنات ہیں۔ وہ مرگی کا علاج بھی کیا کرتا تھا۔ ایک مسلمان حکیم بھی مرگی کے علاج میں مشہور تھا۔ قصبے میں ایک پنڈت اور ایک جوتشی تھا۔ یہ بھی غیب کا حال بتایا کرتے تھے۔ قصبے سے تین چار فرلانگ کے فاصلے پر مٹی کے ٹیلے تھے۔ وہاں سادھو رہتے تھے۔ یہ ننگے رہنے والے سادھو تھے۔ سارے جسم پر راکھ مل لیتے تھے۔ ایک ٹیلے میں اُنہوں نے گُف بنا رکھی تھی۔ یہ اُن کا ٹھکانا یا آشرم تھا۔ یہ سادھو بے اولاد عورتوں کو اولاد دینے میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے پاس صرف ہندو عورتیں جایا کرتی تھیں۔ ہندو ان کی بہت خاطر تواضع کیا کرتے تھے۔ یہ جڑی بوٹیوں سے دوائیاں بھی بناتے تھے۔

میں نے ان لوگوں کے متعلق معلومات بہت ہی مختصر بیان کی ہیں۔

سائمن نے ان کے متعلق اتنے زیادہ سوال کئے تھے کہ تمام معلومات دو اڑھائی گھنٹوں میں مکمل ہوتی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ سادھو چیچک کی دیوی کو خوش کرنے کے لئے عجیب وغریب قربانیاں دیا کرتے ہیں جن میں بچے کی جان کی قربانی بھی شامل ہے۔ اور ایک قربانی یہ بھی تھی کہ چیچک کی وبا پھوٹنے سے پہلے سب سے پہلے مریض کو زندہ دریا میں پھینک دیا کرتے تھے۔ ہندوؤں کی بعض رسومات اس قدر حیران کن اور بھیانک تھیں کہ آپ یقین نہیں کریں گے۔ انگریزوں نے آکر ان کی بعض رسمیں ختم کی تھیں۔ ان میں ایک ستی کی رسم تھی۔ کسی عورت کا خاوند مر جاتا تو وہ عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل جایا کرتی تھی۔ ایسی کچھ اور رسمیں بھی تھیں جن میں انسانی قربانی بھی دی جاتی تھی۔ وہ وباؤں کا دور تھا۔ ہیضے کی وبا پھوٹتی تو علاقوں کے علاقے اس کی لپیٹ میں آجاتے اور لوگ دھڑا دھڑ مرتے تھے۔ طاعون سب سے زیادہ خطرناک وبا تھی۔ ہر گھرانے کے آدھے سے زیادہ افراد مر جاتے تھے۔ باقی لوگ بھاگ جاتے تھے۔

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ سیّد آباد جس علاقے میں واقع تھا وہاں کے لوگ بہت ہی پسماندہ اور توہم پرست تھے، پھر بھی میں ذاتی طور پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ بچوں کو کسی رسم کی خاطر یا کسی ٹونے کے لئے قتل کیا گیا ہے۔ ہندوؤں سے کچھ بعید تو نہ تھا لیکن میں انسان کی حیثیت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ یہاں میں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ رہ رہ کر انہی کی طرح توہم پرست ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسلام جیسے عظیم مذہب کی شکل و صورت بگاڑ ڈالی تھی۔ پھر بھی میری رائے یہ تھی کہ سائمن قتل کی تین ملتی جلتی وارداتوں کی تفتیش غلط راستے پر لے جا رہا ہے۔ میں اُس کا ادنیٰ ملازم تھا۔ اُس کی بات کی مخالفت کی جرأت نہیں تھی۔ البتہ اُس کے تجربے، ذہانت اور خوداعتمادی کا میں قائل تھا۔

شکار سے واپس آتے ہوئے وہ دونوں مُخبروں کو الگ لے گیا۔ انہیں معلوم نہیں کیا کہا۔ وہ دونوں راستے ہی میں ہم سے الگ ہوتے اور چلے گئے۔

ریسٹ ہاؤس میں رات کو اس نے تھانیدار کو بلایا اور بند کمرے میں اُس کے ساتھ بہت دیر باتیں کرتا رہا۔ کھانے کے بعد اُس نے ہمیں سونے کی اجازت دے دی۔ ہم صبح اُٹھے تو ریسٹ ہاؤس کے اندر سے ایک جوان عورت نکلی جسے دیکھ کر ہم حیران نہیں ہوتے۔ عورت خوبصورت بھی تھی۔ ہم نے سوچا کہ تھانیدار نے اس عورت کو سائمن کی خاطر تواضع کے لئے پیش کیا ہوگا لیکن سائمن نے ہمارا شک دُور کر دیا۔ اُس نے بتایا کہ یہ جبل پُور کی طوائف ہے جسے رات کو وہاں سے سرکاری طور پر بلایا گیا ہے اور اسے سراغرسانی کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اسے لانے کے لئے دونوں مُخبر گئے تھے۔ سائمن نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔

سب سے پہلے اُسے ایک ہندو بیوی کے بہروپ میں سادھوؤں کے پاس بھیجا گیا۔ اُس نے سادھوؤں کی گُف میں جا کر بتایا کہ شادی کو چھ سال گزر گئے ہیں اولاد نہیں ہوتی۔ اُس نے واپس آکر بتایا کہ سادھوؤں کی گُف کے اندر ایک اور گُف ہے جو باہر کے کسی آدمی کو نظر نہیں آسکتی۔ طوائف پر ایک سادھو نے جنتر منتر پڑھے اور وہ اُسے اندر والی گُف میں لے گیا۔ وہاں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اُسے جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کی بُو آئی، انسانی گوشت یا کسی بھی قسم کے گوشت کی بُو نہیں تھی۔ سادھو نے اُسے شریف بیوی سمجھ کر اُسے جھانسہ دینے میں بہت وقت صرف کیا۔ وہ بھی شریف بیوی بنی رہی اور اُس کی آنکھیں اِدھر اُدھر گھومتی رہیں۔ سادھو نے اُسے کہا کہ اُسے تیرہ روز اُس کے پاس آنا پڑے گا۔ سادھو نے اُسے ایک ٹونہ یہ بتایا کہ کسی کا دُودھ پیتا بچہ مر جائے تو اُس کی لاش پر ٹوکرا الٹا رکھ کر ٹوکرے پر بیٹھ کے نہاؤ تو اولاد ہوگی، یا اگر کسی کا تین چار ماہ کا بچہ اپنے ہاتھوں مار کر اس پر نہاؤ تو مراد جلدی پوری ہوگی۔ طوائف سائمن سے سبق لے کر آئی تھی۔ اُس نے سادھو سے کہا کہ اُسے کسی نے بتایا ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر کا ایسا بچہ دیکھو جس کے گال پر کالا تِل ہو۔ اُسے کسی طرح لے آؤ۔ اُس نے یہ نہیں بتایا کہ اس بچے کا وہ کیا کرے گا۔

سادھو نے اُسے بتایا کہ اتنا بڑا بچہ بے اولاد عورت کو اولاد دینے کے ٹونے میں کام نہیں آسکتا۔ بچہ تین چار ماہ کا ہونا چاہیئے۔ طوائف نے کریدنے کی بہت کوشش کی لیکن سادھو نے بتانا نہ چاہا یا اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ پانچ چھ سال عمر کے بچے کو کس ٹونے کے لئے قتل کیا جاتا ہے۔ سادھو نے اُسے کہا کہ وہ تیرہ روز متواتر اُس کے پاس آئے۔ اسی سے اُس کی مراد پوری ہو جائے گی، کسی کے بچے کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ طوائف وہاں سے یہ رپورٹ لائی کہ ان سادھوؤں نے عورتوں کو پھانسنے کا فراڈ چلا رکھا ہے اور وہاں بدکاری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس کے بعد طوائف کو پرانے زمانے کے سفید بُرقعے میں پیر کے پاس بھیجا گیا۔ وہاں بھی اُس نے کہا کہ اُسے اولاد نہیں ہوتی۔ وہاں سے بھی وہ یہی رپورٹ لائی کہ ننگے سادھوؤں اور اس پیر میں کوئی فرق نہیں۔ طوائف نے پیر کی در پردہ دنیا کو اچھی طرح دیکھا۔ وہاں سے اُسے کچھ نہ ملا۔۔۔ اُسے اُس حکیم کے پاس بھیجا گیا جس کے متعلق مشہور تھا کہ مرگی کا علاج کرتا ہے۔ وہ دیہاتن کے روپ میں حکیم کے پاس گئی اور اُسے بتایا کہ اُس کا خاوند مرگی کا پُرانا مریض ہے۔ ایک درجن حکیم اور سیانے ہار چکے ہیں اُسے افاقہ نہیں ہُوا۔ حکیم نے اُسے ایک نسخہ بتا کر کہا کہ یہ چیزیں لا دو تو وہ دوائی بنا دے گا۔ حکیم نے جو چیزیں بتائی تھیں ان میں سے مجھے تین یاد رہ گئی ہیں۔ سانپ کی سری جو سانپ کو مار کر فوراً اُتاری گئی ہو۔ دو چمگادڑ اور انسانی کھوپڑی کی تھوڑی سی ہڈی۔ کھوپڑی خواہ سَو سال پرانی ہو یا ایک سال۔ یہ ہڈی قبرستان سے حاصل کی جا سکتی تھی۔ طوائف نے حکیم سے کہا کہ وہ منہ مانگے پیسے لے لے اور یہ اشیاء خود اکٹھی کر کے دوائی بنا دے۔ حکیم نے کہا کہ وہ اتنا وقت نہیں نکال سکتا کہ سانپ، چمگادڑ اور کھوپڑیاں ڈھونڈتا پھرے۔ اُس کے پاس دوائی نہیں تھی۔ اُس نے طوائف کو بتایا کہ جو مریض اُسے مطلوبہ اشیاء لا دیتا ہے اُسے وہ دوائی تیار کر کے پوری کی پوری دے دیتا ہے اور اپنی اُجرت لے لیتا ہے۔

تھانیدار ہمارے پاس بیٹھا تھا۔ اُس نے کہا ــــ "یہ انگریز پاگل ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں لوگ سمجھتے ہیں کہ انگریز عقل مند ہوتے ہیں" ــــ میں بھی تفتیش

کے اس طریقے کو احمقانہ سمجھ رہا تھا۔ یہ عورت بھیس بدل بدل کر جا اور آ رہی تھی۔ میں اُس کی اتنی تعریف ضرور کروں گا کہ غیر معمولی طور پر ہوشیار اور ذہین عورت تھی۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سائمن اُسے پہلے سے جانتا تھا یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس عورت کو پہلے سے ضرور جانتا ہو گا اور اُسے مخبری اور سراغرسانی کی پہلے سے ہی ٹریننگ ملی ہوئی ہو گی۔ ذرا سے وقت میں اُسے اس پیچیدہ کام کے لئے تیار کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اچھی خاصی جاسوس معلوم ہوتی تھی۔ یہ تو سائمن نے کہا تھا کہ یہ جبل پور کی طوائف ہے ورنہ میں اُسے ایسی نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ سائمن اُسے الگ کمرے میں کیا کیا ہدایات دیتا اور کس طرح ریہرسل کراتا تھا، اس لئے میں آپ کو تفصیلات نہیں سُنا سکتا۔ یہ ساری باتیں بعد میں کچھ سائمن نے خود سنائیں۔ اور بعض سب انسپکٹر کیدار ناتھ نے بتائی تھیں۔

اگلے دن یہ عورت دیہاتن بن کر اُس مسلمان عامل کے پاس گئی جو مرگی کا علاج کرتا تھا اور جس کے قبضے میں جنات تھے۔ اُسے بھی اس نے کہا کہ اس کا خاوند مرگی کا مریض ہے۔ اُس نے واپس آ کر بتایا کہ یہ عامل پُراسرار سا آدمی ہے۔ گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں لال سرخ اور باہر کو نکلی ہوتی ہیں۔ اس آدمی نے اُسے بتایا کہ دوائی بیس روز بعد ملے گی اور ایک ہفتے کی دوائی کی قیمت ایک سَو روپیہ ہو گی۔ علاج مسلسل تین مہینے ہو گا۔ یاد رکھیے کہ ایک سو روپیہ ایک ہفتہ بہت زیادہ قیمت تھی۔ یہ رقم آج کے ایک ہزار روپوں کے برابر تھی۔ عامل نے اُسے بتایا کہ اگر وہ تین مہینوں کے علاج کے لئے بارہ سَو روپے ادا کر سکتی ہے تو بیس روز بعد خاوند کو لے کے آجائے۔ اس عورت نے عامل کو رام کرنے اور راز کی کوئی بات معلوم کرنے کی کوشش کی مگر کوئی راز معلوم نہ ہو سکا۔ اس سے یہ رپورٹ لے کر سائمن نے حکیم کو بلوا لیا جس نے اس عورت کو نسخہ بتایا اور اشیاء لانے کو کہا تھا۔ حکیم سے جب سائمن پوچھ گچھ کر رہا تھا میں وہاں موجود تھا۔ سائمن نے اُس کی حکمت اور ذہانت کو پرکھنے کے لئے بہت

سے سوال کئے۔ میری رائے کے مطابق حکیم اپنے اس فن سے آگاہ تھا۔ اُس نے نہایت اچھے جواب دیئے۔ سائمن نے اس سے سانپ کی کھوپڑی، چمگادڑوں اور انسانی کھوپڑی کی ہڈی کے متعلق پوچھا کہ ان میں کیا خوبیاں ہیں حکیم نے ہر شئے کے اجزا تے ترکیبی بتاتے، دوائی بنانے کا طریقہ بتایا اور دماغ پر اس کے اثرات بتائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سائمن قائل ہو

گیا تھا۔ حکیم نے یہ کہہ کر اس انگریز کو پوری طرح قائل کر لیا کہ پسماندہ لوگ مرگی کو جن بھوت اور آسیب سمجھ کر تعویذوں سے علاج کراتے ہیں۔ یہ مرض دماغ کے ایک چھوٹے سے حصّے کے بے قابو ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ ایک مرض ہے آسیب نہیں۔

سائمن نے اس سے پوچھا کہ وہ یا اس کے مریض انسانی کھوپڑی کی ہڈی کہاں سے لاتے ہیں؟ اُس نے بتایا کہ بعض جگہوں پر بہت ہی پُرانی قبریں ہیں جہاں کی مٹی اتنی بہہ گئی ہے کہ ہڈیوں کے پنجر ننگے ہو گئے ہیں۔ ان سے ایک آدھ اِنچ لمبی اور اتنی ہی چوڑی ہڈی لے آنا کوئی مشکل نہیں۔ اس کے بعد سائمن نے اُس سے پوچھا کہ اگر وہ یہ دوائی خود ساری چیزیں اکٹھی کر کے بنائے تو مریض سے کتنے پیسے لے گا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ پچاس روپوں میں مریض کو ٹھیک کر سکتا ہے۔ تب سائمن نے اُس سے پوچھا کہ وہ کونسی دوائی ہے جو ایک سَو روپے کی ایک ہفتے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ حکیم نے جواب دیا کہ ایسی کوئی دوائی نہیں، البتہ مریض کی مجبوری سے ہم جس قدر فائدہ اٹھائیں اُٹھا سکتے ہیں۔

"کیا انسانی دماغ (مغز) کسی دوائی میں استعمال ہوتا ہے؟" سائمن نے پوچھا۔

"میں نے حکمت کی ساری کتابیں نہیں پڑھیں"۔ حکیم نے جواب دیا ــــ "مَیں نے سُنا ہے کہ انسانی دماغ کسی دوائی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دوائی دماغی خرابیوں کو ٹھیک کرتی ہے۔"

حکیم کا بولنے کا انداز اور شائستگی بتا رہی تھی کہ جُرم کے ساتھ اس کا

دُور پار کا بھی تعلق نہیں۔ سائمن نے تین گھنٹے صرف کر کے اپنے مطلب کی باتیں معلوم کر لیں اور حکیم کو رخصت کر کے تھانیدار کو بُلایا۔ فوراً بعد وہ سب کو ساتھ لے کر رُیسٹ ہاؤس سے نکلا اور کہا کہ وہ عامل کے گھر پر چھاپا مارنا چاہتا ہے۔ میں بھی ساتھ تھا ... عامل کا مکان الگ تھلگ سا تھا۔ بڑے ہی پُرانے دَور کی یادگار مکان تھا۔ ہم سائمن کے ساتھ اُس کے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ وہاں موجود تھا۔ نم آلود کمرے میں کنستر، بوتلیں، تھیلیاں اور ایسی بے شمار چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہاں عجیب سی بدبُو تھی۔ وہ ایک انگریز ڈی۔ ایس۔ پی اور ایک تھانیدار کو دیکھ کر اتنا گھبرایا کہ اُس کا رنگ صاف پیلا پڑ گیا۔ اُس کا چہرہ کھُردرا اور آنکھیں ڈراؤنی تھیں۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ تھانیدار نے اُسے کہا کہ یہ صاحب بہادر پولیس کپتان ہیں تو عامل نے سائمن کی طرف یُوں دیکھا کہ اُس کی آنکھیں اور زیادہ باہر نکل آئیں اور منہ کھُل گیا۔ سائمن نے اُس سے بات کی تو اُس کا منہ اور زیادہ کھُل گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم اس دوائی میں کونسی چیز استعمال کرتے ہو جس کے تم ایک سَو روپیہ ایک ہفتے کی خوراک کے لیتے ہو؟" سائمن نے اس سے پُوچھا۔

اُس کی زبان ہتھتیانے لگی لیکن جواب کچھ بھی نہ دیا۔ تھانیدار نے سائمن کا سوال دہرایا تو عامل نے اسی گھبراہٹ کے عالم میں اُس دروازے کی طرف دیکھا جو اندر کی طرف کھُلتا تھا۔ پولیس کے لئے اتنا سا

اشارہ کافی ہوتا ہے۔ سائمن اس دروازے کی طرف چلا تو عامل تیزی سے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ صاف طور پر کانپ رہا تھا۔ سائمن نے تھانیدار سے کہا ــــ "اسے دھکا دے کر ہٹاؤ۔ ہم اندر چلیں گے۔"

تھانیدار نے اُسے دھکیلا تو اُس نے پاؤں جما لئے اور پیٹھ دروازے کے ساتھ لگا لی۔ اُس کی زبان اچانک چل پڑی۔ اُس نے کہا ــــ "اندر میری بیوی اور جوان بیٹیاں ہیں۔ پردہ کرتی ہیں۔ آپ لوگ یہیں ٹھہریں، میں

پردہ کرالوں"۔ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ گھر میں اکیلا رہتا ہے مگر کسی کو
یاد نہ رہا۔ اُس نے بڑی تیزی سے ایک کواڑ کھولا۔ اندر گیا اور اندر سے
زنجیر چڑھا دی۔ اُس کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہم سب نے
دروازے کو دھکے دیئے۔ کواڑ بہت مضبوط تھے۔ کوئی دوڑ کر ڈیوڑھی
والے دروازے کی طرف گیا۔ وہ بھی اندر سے بند تھا۔ دروازہ توڑنے
کی کوششیں ہونے لگیں۔ پڑوسیوں سے دو کدالیں مل گئیں۔ ان سے
کواڑ توڑے گئے تو آگے صحن تھا۔ دو طرف برآمدہ۔ مکان ہیبت ناک
سا تھا۔ بدبُو اور تعفن بہت تھا۔ کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ آوازیں
دیں۔ کوئی جواب نہ ملا۔

ایک کمرے کے بند دروازے کے اُوپر اور نیچے سے دھواں نکلنے
لگا۔ کپڑے جلنے کی بدبُو بھی آنے لگی۔ اُس دروازے کو توڑا۔ جہاں سے
کواڑ ٹوٹتا تھا وہاں سے دھوئیں کے رُکے ہوئے بادل باہر کو اتنی زور
سے آتے تھے کہ سامنے ٹھہرا نہیں جاتا تھا۔ تعفن ناقابل برداشت تھا۔
کواڑ ٹوٹ گیا تو رُکا ہوا دھواں باہر کو آیا۔ سب اِدھر اُدھر ہو گئے۔ تپش
اور بدبُو کمرے کے قریب جانے نہیں دیتی تھی۔ اندر سے کسی کے کراہنے
کی بلند آواز آئی۔ اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ سب پانی لینے دوڑے۔ باہر سے
بھی لوگوں کو بلایا گیا۔ لوگ پانی کے گھڑے اور بالٹیاں اٹھا لاتے اور منہ
سر چادروں اور پگڑیوں میں لپیٹ کر کمرے کے اندر پانی پھینکنے لگے۔ سائمن
نے آگ بجھانے کا کام ایسے طریقے سے منظم کیا کہ آگ بجھائی گئی مگر بدبُو کی وجہ
سے کوئی اندر نہیں جاتا تھا۔ کمرے کی کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ روشندان بھی
کوئی نہیں تھا۔ سائمن نے تھانیدار سے کہا کہ چھت پر کچھ آدمی جا کر چھت
میں دو تین فٹ چوڑا سوراخ کر دیں۔

انگریز حاکم کو خوش کرنے کے لئے کئی آدمی کدالیں لے کر دوڑتے
ہوئے اُوپر چلے گئے اور خاصا سوراخ کر دیا۔ دھواں سوراخ کے راستے
خارج ہونے لگا۔ دروازے میں چادریں پھیلا کر اور اِدھر اُدھر سے پکڑ

کر زور زور سے ہلائی گئیں۔ اس سے دُھواں اُوپر کو نکل گیا۔ چار پانچ
لالٹینیں جلا کر اندر گئے۔ بہت ساری چیزیں جل گئی تھیں۔ کچھ آدھ جلی تھیں۔
مٹی کے طرح طرح کے برتن برآمد ہوئے۔ کام کی جو چیزیں اندر سے نکالی گئیں
اُن میں ایک تو عامل تھا جس کا جسم جل گیا تھا۔ اس کا سارا لباس جل گیا
تھا۔ کھال سیاہ کالی ہو گئی تھی۔ سَر کے بال جل گئے تھے۔ سر اور چہرے کا
رنگ ایک ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں سے کھال سے خون بہہ رہا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں
مُڑ گئے تھے اور اس کا جسم دیکھ کر دل پر ہول طاری ہوتا تھا، مگر وہ زندہ
تھا۔ اُسے چارپائی پر ڈال دیا گیا۔

دوسری کام کی جو چیز برآمد ہوئی وہ مٹی کا ایک بیسن تھا۔ اس میں
ایک بچے کی کھوپڑی رکھی تھی جو جُھلس گئی تھی۔ سَر کے بال اور آنکھوں کے
بال جل گئے تھے۔ چہرے پر پُورا گوشت تھا مگر جُھلسا ہُوا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا
جیسے مٹی کے اس بیسن میں کوئی سیاہ مادہ تھا جس میں اس کھوپڑی کو رکھا گیا
تھا۔ مادہ جل گیا تھا۔ کام کی ایک چیز اور ملی۔ یہ ایک کنستر سا تھا جسے کھولا تو اندر
سے دو کھوپڑیاں نکلیں۔ یہ صرف ہڈیاں تھیں۔ گوشت کا نشان نہ تھا۔ یہ کھوپڑیاں
بھی بچوں کی تھیں۔

تھانیدار نے بتایا کہ عامل سرگوشیوں میں کچھ بول رہا ہے۔ سائمن نے
اُس کے ہونٹوں سے کان لگائے، لیکن عامل زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔
اُس نے خودکشی کی بڑی ہی ظالمانہ اور کامیاب کوشش کی تھی۔ سائمن نے
بعد میں بتایا کہ عامل نے مرتے مرتے کہا تھا کہ انسانی بچے کا دماغ مرگی کی دوائی
میں شامل کیا جاتا ہے۔ عامل یہ بتائے بغیر مر گیا کہ اُس نے بچے کس طرح اغوا اور
قتل کئے؟ اُس کے ساتھی کون تھے؟ اغوا کا طریقہ کیا تھا؟ اور وہ صرف ہندوؤں کے
بچوں کو کیوں قتل کرتا تھا؟ اور کیا گال پر کالا تِل دوائی کے لئے ضروری تھا؟ اور
ایسے کئی ایک سوال تھے جن کے جواب عامل اپنے ساتھ قبر میں لے گیا۔ پیچھے قیاس
آرائیاں رہ گئیں جن کے مطابق وہ بچے کو ورغلا کر گھر لاتا، اسکا گلا دبا دیتا، مرنے

کے بعد بچے کا سر جسم سے جدا کر دیتا اور جسم رات کو باہر لے جا کر دفن کر دیتا تھا۔

طغیانی کا طلسم

جلال الدین صدیقی

رانچی صوبہ بہار کا ایک پہاڑی شہر ہے اور اب صوبے کا موسمِ گرما کا دارالحکومت۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران یہ شہر اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ فوجوں کا ایک وسیع کیمپ بن گیا تھا اور یہاں دو ہوائی اڈے بھی بناتے گئے تھے جہاں لڑاکا اور بمبار طیارے اُترتے چڑھتے رہتے تھے۔ برما فرنٹ کی تھکی ہوئی فوجوں کو یہاں آرام کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ رانچی کے مضافات میں جہاں تک نظر جاتی تھی، کچی بارکیں اور خیمے نظر آتے تھے اور شہر میں فوجی گاڑیوں اور اتحادی ملکوں کے فوجیوں کی وجہ سے خوب چہل پہل رہتی تھی۔ اگر وہاں فوجی کیمپ اور ہوائی اڈے نہ بنتے تو رانچی میں صرف یہی خوبی رہ جاتی کہ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے وہاں کی آب و ہوا خوش گوار تھی اور گرمی نام کو نہیں تھی، ورنہ رانچی کوئی ایسا اہم شہر نہیں تھا۔

رانچی کے دیہاتی علاقے میں ہندو اور مسلمان آباد تھے یا جنگلی انسان۔ مسلمان تو دُور سے پہچانے جاتے تھے کیونکہ وہ صاف سُتھرے کپڑے پہنتے اور صاف سُتھرے رہتے تھے۔ ان کا پہناوا پاجامہ اور قمیض تھا۔ غربت اور پسماندگی تو جیسے ان کی لوحِ تقدیر پر لکھ دی گئی تھی۔ بہت کم گھرانے ایسے تھے جہاں تعلیم کی روشنی پہنچی تھی۔ میرا گھرانہ انہی چند ایک خوش نصیبوں میں

سے تھا۔ رانچی کے دیہات کی اکثریت جنگلیوں کی تھی۔ ان کے رنگ سیاہ کالے، نقش ونگار آسٹریلیا کے قدیم حبشی باشندوں ABORIGINES سے ملتے جلتے تھے اور یہ لوگ، کیا مرد کیا عورتیں، مادر زاد ننگے رہتے تھے۔

مسلمان ان جنگلیوں سے کہا کرتے تھے کہ تم جن دیوتاؤں کے ڈر سے کپڑے نہیں پہنتے وہ تمہارے مذہبی پیشواؤں کی فریب کاری ہے۔ آسمانوں اور زمین پر صرف ایک دیوتا کی حکمرانی ہے جسے خدا کہتے ہیں۔ مگر ان مسلمان دیہاتیوں کی اپنی یہ حالت تھی کہ وہ خدا کی جگہ انسانوں کی پوجا کرتے تھے جنہیں ہم پیر کہا کرتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ صرف ہمارا علاقہ ایسا ہے جہاں پیروں کی حکمرانی ہے اور میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان بھی جنگلیوں کے ساتھ رہ بس کر بے حد توہم پرست ہو گئے ہیں لیکن تشکیلِ پاکستان کے وقت ہم ہجرت کر کے مغربی پاکستان میں آئے تو پتہ چلا کہ یہ خطہ جسے ہم علم وادب اور تہذیب کا گہوارہ سمجھا کرتے تھے، پیروں کی گرفت میں ہے اور دیہات میں تو لوگ خدا اور رسولؐ کو کم اور پیروں کو زیادہ مانتے ہیں۔

بالکل ایسے ہی پیر ہمارے ہاں بھی تھے جنہیں نذر نیاز نہ دو تو بارش نہیں ہوتی تھی، حالانکہ رانچی ایسا پہاڑی مقام ہے جہاں ہم بارش سے اُکتا جایا کرتے تھے۔ جون کے وسط سے اکتوبر کے آخر تک مسلسل برسات رہتی تھی۔ مہینہ مہینہ بھر سورج نظر نہیں آتا تھا۔ اس برسات کو مسلمان پیر و مرشد کی کرامات کہا کرتے تھے۔ یہاں کی طرح وہاں بھی پیر بے اولادوں کو اولاد دیا کرتے تھے اور انسانوں کی زندگی اور موت اُنہی کے ہاتھ میں تھی۔

میں رانچی کے ایک سکول میں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ والد صاحب مرحوم بھی لکھ پڑھ لیتے تھے اور ہمارا سارا گھرانا ایک ایسے پیر کا مرید تھا جس نے اپنا شجرۂ نسب حضرت سلیمانؑ سے لا رکھا تھا۔ میں بھی تمام دیہاتیوں کی طرح مانا کرتا تھا کہ ہمارے پیر صاحب کے قبضے میں جنوں کی پوری فوج ہے۔

مجھے والد صاحب مرحوم سنایا کرتے تھے کہ ان کی موجودگی میں کئی بار پیر صاحب نے جن حاضر کئے ہیں لیکن وہ نظر نہیں آتے۔ والد صاحب نے بتایا تھا کہ

پیر صاحب کے خصوصی کمرے میں پانی سے بھرا ہوا ٹب رکھا ہوتا ہے جس میں سے نہایت میٹھی سُر تال پر بانسری اور ستار بجتی سنائی دیتی ہے اور اس کے ساتھ گھنگھروؤں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے۔ پھر پیر صاحب پانی کی طرف یوں ہاتھ مارتے ہیں جیسے پتھر پھینکا جاتا ہے اور کہتے ہیں — "بس جاؤ۔ چلے جاؤ"۔ جب پیر صاحب ہاتھ ٹب کی طرف کرتے ہیں تو پانی کی سطح پر شرارے چمکتے ہیں اور موسیقی بند ہو جاتی ہے۔

یہ تماشہ میں نے بھی دیکھا۔ میں میٹرک کا امتحان دے چکا تو ایک روز والد صاحب نے مجھے نہایت اچھی طرح غسل کرنے کو کہا۔ میں نہا چکا تو مجھے نئے کپڑے پہناتے گئے اور والد صاحب نے مجھے کہا کہ اب تم جوان ہو گئے ہو اس لئے آج تمہیں پیر صاحب کی بیعت کے لئے لے جا رہا ہوں۔ یہ ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے۔ شام کے کھانے کے بعد مجھے والد صاحب پاپیادہ پیر صاحب کے گاؤں میں لے گئے جو ہمارے گاؤں سے پانچ میل دور تھا۔ پیر صاحب شام کے بعد مریدوں کو شرفِ باریابی بخشا کرتے تھے۔ راستے میں والد صاحب مجھے ہدایت دیتے رہے کہ پیر صاحب کے سامنے دو زانو ہو جانا، پہلے ان کے گھٹنے چھونا پھر ان کے پاؤں پر سجدہ کرنا۔ وہ تمہارے سر پر ہاتھ پھیریں گے تو تم سجدے سے اُٹھنا اور ان کی طرف پیٹھ کئے بغیر پیچھے ہٹ آنا۔

ہم وہاں پہنچے تو والد صاحب نے جوتے باہر کی دہلیز پہ اُتار دیئے اور میرے بھی اُتروا دیئے اور پیر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اندر مٹی کے سات دیئے جل رہے تھے۔ سامنے مسند پہ پیر صاحب بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ نیچے فرشی دری پر بیس پچیس مرید سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مسند کے قریب پانچ جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ کمرے میں ایسی خاموشی طاری تھی کہ سانسوں کی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ والد صاحب نے مجھے بازو سے پکڑا اور پیر صاحب کے سامنے جا کھڑا کیا پھر پیر صاحب کے پاؤں پہ سر رگڑا اور سر اُٹھا کر ہاتھ جوڑ لئے۔ انہوں نے گڑگڑا کر کہا — "حضور یہ گنہگار بچہ مجھ گنہگار کا بچہ ہے جو مجھے حضور نے بخشا تھا۔ اس بدبخت کو حضور کے

سجدے کے لئے لایا ہُوں۔ حضور اجازت دیں تو بچے کو حضور کے قدموں
میں پیش کروں۔ یہ حضور کی اولاد ہے۔"

حضور نے سَر ہلایا۔ والد صاحب نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے پیر صاحب
کے گھٹنے چھُوئے پھر ان کے پاؤں میں سر رکھ دیا۔ اُنہوں نے میرے سر
پر ہاتھ پھیرا اور میں سجدے سے اُٹھا۔ دیکھا کر والد صاحب پانچ روپے کا نوٹ
پیر صاحب کے قدموں میں رکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی نے لپک کر نوٹ
اُٹھا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے قریب بیٹھی ہوئی ایک لڑکی پیر صاحب کو
کنکھیوں سے دیکھتی اس لڑکی سے نوٹ چھیننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن
اس لڑکی نے جلدی سے نوٹ اپنے سینے میں قمیض کے اندر چھُپا لیا۔

میں جنّوں کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھا اور ڈر بھی رہا تھا۔ پیر
صاحب کی مسند کے قریب ایک ٹب رکھا تھا جس میں پانی تھا۔ نصف
گھنٹہ گذر گیا۔ کمرے میں سکوت طاری رہا۔ مرید آتے رہے جن میں عورتیں
بھی تھیں۔ سب نے پیر صاحب کے پاؤں پر سجدہ کیا اور ان کی طرف
پیٹھ کئے بغیر اُلٹے پاؤں چلتے دری پر بیٹھ گئے۔ مسند کے قریب ایک
دروازہ تھا جو دوسرے کمرے میں کھُلتا تھا۔ دروازہ کھُلا اور ایک آدمی
نمودار ہُوا۔ بالشت بھر لمبی داڑھی، سر پر ململ کی ٹوپی، سفید قمیض اور
چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے پیر صاحب کے سامنے
دو زانو ہو کر بلند آواز سے کہا ۔۔۔ "حضورِ انور! عالشّہ والا جنّ آگیا ہے۔"

پیر صاحب اُونگھ سے بیدار ہو گئے۔ آنکھیں پھاڑ کر قہقہہ لگایا اور
بولے۔"وہ مردود آگیا ہے؟ اسے کون لایا ہے؟"

"دو ایلچی ساتھ ہیں حضورِ انور!"

"اوہ، حضرت سلیمان علیہ السلام کے خاص ایلچی۔" پیر صاحب نے
ایک اور قہقہہ داغا اور تحکمانہ لہجے میں بولے۔"حاضر کرو۔"

وہ آدمی تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پیر صاحب نے
گاؤ تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرا اور ہاتھ ٹب کی طرف جھٹک دیا۔ پانی کی سطح

پر شرارے چمکے اور پانی سے بنسری اور ستار کی ایک ناچ دُھن اُٹھنے
لگی۔ اس کی سنگت میں دھیمے دھیمے گھُنگھرو بجنے لگے۔ یہ دُھن دھیمی تھی
اور اس قدر میٹھی جیسے جادُو جگا رہی ہو۔ میں نے کبھی ایسی دُھن نہیں
سُنی تھی۔ پھر یوں محسوس ہونے لگا جیسے موسیقی کی لہریں کمرے میں
پھیل رہی ہوں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں والد صاحب کے
ساتھ لگ گیا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ کمرے کی فضا میں جنّ اور پریاں موجود
ہیں اور یہ دُھن جنّ یا پریاں ہی بجا سکتی ہیں۔ کوئی انسان اتنا میٹھا نغمہ
نہیں بجا سکتا۔ مجھ پر طلسم سا طاری ہو گیا اور اس طلسم میں مجھے پیر صاحب
جنّوں کے شہنشاہ نظر آنے لگے۔ بے اختیار جی چاہا کہ ان کے پاؤں
پر ایک اور سجدہ کروں۔

اچانک پیر صاحب کی آواز گرجی ۔۔۔"اب میرے ساتھ بات کرو۔"

موسیقی یک لخت بند ہو گئی۔

پیر صاحب نے عتابی لہجے میں کہا۔"تم اس غریب لڑکی کو کیوں
پریشان کرتے ہو؟"

پانی کے ٹب میں سے ایسی آواز آئی جو کسی بچے کی طرح بھی تھی
اور عورت کی طرح بھی۔ آواز دھیمی تھی جیسے دُور سے آرہی ہو۔ آواز
تھی ۔۔۔"اس نے میرے چُولہے پر پیشاب کر دیا تھا۔ میں اس کے سارے
خاندان کو تباہ کر دوں گا۔"

"تم میرے قیدی ہو بدبخت!" ۔۔۔ پیر صاحب نے غصّے سے کہا۔ "میں
تمہیں زندہ جلا دوں گا۔" ۔۔۔ پیر صاحب نے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیر کر پانی
کی طرف جھٹکا تو پانی میں شرارے چمکے۔ اس کے ساتھ ہی کراہنے کی آواز
سنائی دی اور یہ بھی ۔۔۔"میری آنکھیں جل گئی ہیں۔ میری آنکھیں ...."

"لے جاؤ اسے" ۔۔۔ پیر صاحب نے حکم دیا ۔۔۔"اس پر حضرت سلیمان
علیہ السلام کی لعنت نازل ہوگی .... کل اسے حاضر کرو۔"

اور کمرے میں پھر سکوت طاری ہو گیا۔ مریدوں میں سے ایک ادھیڑ

عمر آدمی اُٹھا اور سر پیر صاحب کے پاؤں پہ رکھ دیا اور رو رو کر کہنے لگا۔
"حضور! میری بچی کو اس جن سے چھڑا لیجئے۔ وہ مر رہی ہے۔"

پیر صاحب نے سر ہلایا اور ہاتھ اوپر کر کے کہا ـــــ "کل رات عائشہ کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں نے اس کے جن کو قید کر لیا ہے۔"

پانی میں سے آتی ہوئی آواز اور پیر صاحب کے ہاتھ جھٹکنے سے پانی سے اُٹھتے ہوئے شرارے میرے اعصاب پر سوار ہو گئے۔ یہ کوئی جادو یا مسمریزم نہیں تھا۔ کوئی شک ہی نہیں تھا کہ پیر صاحب کے کمرے میں جن آتے ہیں اور ان جنوں پر پیر صاحب کی حکمرانی ہے۔ چنانچہ میں سچے دل سے پیر صاحب کا مرید بن گیا اور ہفتے میں ایک بار اُن کے حضور حاضری دینے لگا۔ اس عقیدت مندی کا یہ اثر ہُوا کہ میرے دل میں خُدا اور رسولؐ کا نام صرف نام کی حد تک رہ گیا۔ میں اس عقیدے کا قائل ہو گیا کہ کائنات کا نظام ہمارے پیر صاحب کے دم قدم سے چل رہا ہے۔

یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے جب میں ان کا مرید بنا تھا۔ پھر میں والد صاحب کی دکان پر بیٹھنے لگا۔ اگلے سال شہر فوجیوں سے بھرنے لگا تو دکان خوب چمکنے لگی۔ دکان کے ساتھ ہی میں نے لکڑی کا ایک کشادہ کھوکھا کھڑا کر کے چائے کی دکان بنالی جو فوجیوں کی وجہ سے سونے کی کان ثابت ہُوئی۔ یہ فوجی برما فرنٹ سے رانچی کے علاقے میں آرام کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ ان کے پاس بے شمار پیسے ہوتے تھے جو وہ پاگلوں کی طرح بازاروں میں خرچ کرتے پھرتے تھے۔ ان پیسوں کا بہت سارا حصّہ ہماری دکان میں چلا آرہا تھا جسے میں اپنے پیر صاحب کی کرامت سمجھتا تھا۔

جنگ ختم ہو گئی۔ ہم نے شہر میں مکان بنا لیا تھا اور اس میں منتقل ہو گئے تھے جس سے پیر صاحب کا دربار پندرہ میل دُور ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں ہفتے میں ایک بار اُن کے ہاں حاضری ضرور دیتا تھا۔

اگست ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے۔ برِصغیر میں سیاسی سرگرمیاں اور مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان زور پکڑ گیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا

ہو کر بڑھ گئی تھی۔ فوجیوں کی رونق بھی کم ہو گئی تھی جس سے چائے کی دکان ذرا ٹھنڈی پڑ گئی لیکن ہم نے دوسری دکان پر توجہ مرکوز کر دی۔ پہلے منیاری کا سامان تھا، اب کپڑا بھی رکھ لیا۔ اس دکان کے لئے مال خریدنے کے لیے والد صاحب نے مجھے کلکتے بھیجا۔ رانچی سے چھوٹی ریل گاڑی NARROW GAUGE چلا کرتی تھی جو دن بھر کے پہاڑی سفر کے بعد آسن سول کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا دیتی تھی۔ وہاں سے بڑی ریل گاڑی ملتی تھی۔ کلکتے جانے والی گاڑی شام کے بعد چلتی تھی۔

میں آسن سول پہنچا۔ کلکتے والی گاڑی ہوڑا ایکسپریس جو لاہور سے کلکتے تک جاتی تھی، کھچاکھچ بھری ہوتی تھی۔ اس قدر رش کہ پائیدان بھی خالی نہیں تھے۔ میرے پاس صرف ایک بیگ تھا۔ میں ایک ڈبے کے پائیدان پر ہی بیٹھ گیا۔

گاڑی چلنے والی تھی جب ایک جواں سال آدمی میرے پاس آ رکا۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ مجھے کہنے لگا ـــــ "کسی پائیدان پر بھی جگہ نہیں ملی۔ ذرا پرے ہو جائیں تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی بیٹھ جاؤں۔"

میں سرک گیا اور وہ بھی میرے ساتھ لگ کر پائیدان پر بیٹھ گیا۔ ڈبے کا دروازہ کھُلا تھا جو سواریوں کے سامان کے ڈھیر کی وجہ سے بند نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں نے گاڑی کے ڈنڈے پکڑ رکھے تھے۔ پیٹھیں دروازے کی طرف کر کے ہم پائیدان پر بیٹھے تھے۔

گاڑی چل پڑی۔ ہوڑا ایکسپریس بہت تیز گاڑی تھی۔ بعض اوقات اتنے سٹیشنوں سے "رن تھرو" ہوتی تھی کہ چار چار گھنٹے کہیں رکتی نہیں تھی۔ گاڑی آسن سول سے نکلی تو ساون کی پھوہار اور ٹھنڈی ہوا نے ہمیں پریشان کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ وہ کہاں تک جائے گا۔

"ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ ٹکٹ کہاں تک کا لیا ہے؟

"مجھے جس منزل تک جانا ہے، اس کے لئے ٹکٹ کی ضرورت نہیں

پڑتی "۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

ہم گلے پھاڑ پھاڑ کر باتیں کر رہے تھے کیونکہ گاڑی کے شور اور ہوا کے تھپیڑوں سے اپنی آواز بھی مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ میرے ہمسفر کے لب و لہجے میں غم اور شکست تھی۔

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ گھر سے بھاگا ہُوا ہے یا کوئی اور بات ہے کہ اُس نے مجھ سے پوچھا۔۔۔ "آپ پیروں کو مانتے ہیں؟"

"میں ایک ایسے پیر کو مانتا ہوں جو جنّوں کا بادشاہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس نے ہمارے جھونپڑے کو دو منزلہ پکّا مکان بنا دیا ہے اور ہماری کایا پلٹ دی ہے۔"

"وہ پیر کہاں ہوتا ہے؟" ۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

"رانچی کے ایک گاؤں میں؟"

"کون سا گاؤں؟"

"ہٹیا" ۔۔۔ میں نے جواب دیا۔

"ہٹیا والے پیر؟ ۔۔۔ اوہ!" اُس کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی اور اُس کا سَر جُھک گیا۔ ذرا دیر بعد اُس نے سَر اُٹھایا اور پوچھا ۔۔۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ اُس کے قبضے میں جنّ ہیں؟" ۔۔۔ میں نے اسے یقین دلایا تو اس نے کہا ۔۔۔ "میں مسلمان ہوں۔ آپ ہی کے علاقے کا رہنے والا ہُوں۔ میں آپ کے پیر صاحب کو جانتا ہوں۔ میں اُن کا مرید نہیں ہوں مگر ان ہی کے ہاتھوں گھر سے بھاگ آیا ہوں" ۔۔۔ اُس نے ذرا سا چُپ رہ کر کہا ۔۔۔ "میں شاید زندہ نہیں رہوں گا۔ مرنے سے پہلے آپ کو پوری بات سنانا چاہتا ہوں۔ اگر میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں تو معاف کر دینا۔ میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔"

اُس نے اپنی کہانی سنا ڈالی جسے میں اپنے الفاظ میں مختصراً بیان کرتا ہُوں۔ یہ آدمی پیر صاحب کے گاؤں سے دو میل دُور کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں اس کا نام نہیں لکھنا چاہتا کیونکہ اب وہ پاکستان میں ہے۔ اب میں اس شخصیت کا مرید ہُوں۔ اب میں اسی کو پیر مانتا ہوں اور خُدا

اور رسولؐ کی عبادت کو ہی اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔

اس نے سنایا کہ وہ اپنی چچا زاد بہن کو چاہتا تھا اور یہ لڑکی بھی اسے دل و جان سے پسند کرتی تھی۔ دونوں کی پاک محبت رنگ لائی اور ان کی منگنی ہو گئی۔ لڑکی کے والدین منگنی کے بعد لڑکی کو پیر صاحب کی مریدنی بنانے کے لئے لے گئے۔ پیر صاحب کو لڑکی پسند آ گئی۔ اُنہوں نے اسے اپنے خاص مریدوں کا اعزاز بخشا اور اپنے دربار کا خصوصی دوپٹہ لڑکی کے سَر پر ڈال دیا۔ یہ دوپٹہ وہ کسی کسی لڑکی پر ڈالا کرتے تھے۔ ہمارے علاقے میں ایسی لڑکی کو عام انسانوں سے بلند درجہ حاصل ہو جاتا تھا۔ یہ اعزاز سات آٹھ لڑکیوں کو حاصل تھا جن میں ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ وہ باری باری یا دو دو کئی کئی دن اور راتیں پیر صاحب کے گھر میں گذارتی تھیں۔ وہ ہجولی لڑکیوں کو طلسماتی سی کہانیاں سنایا کرتی تھیں جنہیں سُن کر دیہات کی لڑکیوں کے دلوں میں بھی خواہش پیدا ہو جاتی تھی کہ انہیں بھی پیر صاحب خصوصی دوپٹہ عنایت فرمائیں۔

میرے ہمسفر نے مجھے سنایا کہ جب پیر صاحب نے اس کی منگیتر کو خصوصی مرید بنا لیا تو لڑکی کے والدین نے منگنی توڑ دی کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو ایک عام آدمی سے بیاہ کر پیر صاحب کی توہین نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں تو دلوں کا سودا ہو چکا تھا۔ لڑکی اسی دنیا میں جنی پلی تھی جہاں پیر صاحب کی حکمرانی تھی لیکن محبت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ لڑکی باغی ہو گئی۔ وہ مسلسل تین دن اور تین راتیں پیر صاحب کے گھر رہی۔

جب آئی تو اُس نے منگیتر سے چوری چھُپے ملاقات کر کے بتایا کہ پیر صاحب اسے اپنی بے نکاحی دلہن بنا چکے ہیں۔ لڑکی نے بتایا کہ پیر صاحب نے اسے ایک نہایت خوبصورت کمرے میں رکھا جہاں رات کے وقت بنسری اور ستار کے دھیمے دھیمے نغمے سُنائی دیتے تھے اور ہلکے ہلکے گھنگھرو بجتے تھے۔ اسے دُودھ پلایا جاتا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد اس کے کانوں میں نہایت سریلی آواز گونجنے لگتی تھی ۔۔۔ "تم پری ہو اور پریاں تمہارے

ساتھ کھیلنے آتی ہیں۔ دیکھو تتلیاں کتنی خوبصورت ہیں"۔۔۔ اور یہ مترنم سرگوشیاں سنتے سنتے اسے اپنے اردگرد نہایت حسین لڑکیاں ہنستی کھیلتی نظر آنے لگتی تھیں۔ پھول بھی نظر آتے تھے جو فضا میں تیرتے تھے۔۔۔ اور جب صبح کے وقت اس کی آنکھ کھلتی تھی تو اس کے سر میں گرانی اور جسم کے جوڑ جوڑ میں درد ہوتا تھا۔

یہ بات حیران کن ہے کہ ایک پسماندہ علاقے کی سیدھی سادی دیہاتی لڑکی کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ اسے ایسا فریب دیا جا رہا ہے جسے وہ پیر صاحب کی کرامت نہیں مان سکتی۔ یہ تو اسے معلوم ہی تھا کہ اس کی عزت اور آبرو لٹ چکی ہے اور اب اس کی ساری جوانی پیر صاحب کے خصوصی کمرے کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ میرا ہمسفر بھی پیر صاحب کا مرید بننے والا تھا کیوں کہ میری طرح اس نے بھی ان کے کمرے میں جنوں کی موسیقی سنی اور پانی پر شرارے چمکتے دیکھے تھے۔ اس نے پانی میں ابھرتی ہوئی جنوں کی آواز بھی سنی تھی۔

جب اس کی منگیتر نے اسے تین راتوں کی آپ بیتی سناتی تو میرے ہمسفر کا عقیدہ بھٹک گیا۔ اسے پیر رقیب کی شکل میں نظر آنے لگا۔ مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کسی سے کہہ سکتا کہ پیر نے اس کی منگیتر کو بے نکاحی بیوی بنا لیا ہے۔ منگیتر اسے چوری چھپے ملتی رہی اور رو رو کر اسے کہتی رہی کہ وہ ہمت کرے اور اسے ساتھ لے کر کہیں بھاگ چلے۔

پیر صاحب اس پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے تیسرے چوتھے روز اسے بلا لیتے تھے اور ہر بار تین دن تین راتیں اسے اپنے پاس رکھتے تھے۔ لڑکی کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی اور پیر صاحب لڑکی کے والدین پر روپوں کا مینہ برسا رہے تھے۔

ایک روز گاؤں والوں نے لڑکی کو اپنے منگیتر کے ساتھ کھیتوں میں چھپ کر بیٹھے دیکھ لیا۔ لوگوں نے لڑکی کو تو کچھ نہ کہا کیونکہ وہ پیر صاحب کی ملکیت تھی۔ البتہ اس آدمی کو پیٹ پیٹ کر بے ہوش کر دیا۔ جب پیر

صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے اس آدمی کو اپنے دربار میں بلا کر حکم دیا کہ اس کے سر پر ایک سو جوتے مارے جائیں۔ دو آدمیوں نے اسے پکڑ لیا اور دو آدمی اس کے سر پر جوتے مارنے لگے۔ وہ بیہوش ہو گیا۔

ہوش میں آیا تو وہ اپنے گھر میں پڑا تھا۔ اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی جس میں وہ خود ہی جل رہا تھا مگر پیر کے خلاف زبان پر ایک لفظ نہیں لا سکتا تھا۔ اتنی پٹائی کے باوجود لڑکی اسے ملی اور اسے اکسانے لگی کہ چلو کہیں بھاگ چلیں لیکن اس آدمی کو ہمت نہ پڑی۔

وہ واقعی ڈرتا تھا۔ جیسا کہ اس نے مجھ سے ذکر کیا۔۔۔ "میں پیر کے جنوں سے بہت ڈرتا تھا۔ اس لئے لڑکی سے ملنے سے بھی گھبراتا تھا لیکن لڑکی مجھے مل ہی لیتی تھی۔"

آخر یہ آدمی لڑکی سے بھاگ اٹھا۔ رانچی سے گاڑی میں بیٹھا اور آسن سول سے ہوڑا ایکسپریس میں بیٹھ گیا۔ میں چونکہ پیر صاحب کا مرید تھا۔ اس لئے ان کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ بہتر یہی ہے کہ وہ کلکتے جا کر محنت مزدوری کر لے، اب واپس گاؤں نہ جائے۔

"آپ پیر صاحب کے مرید ہیں" اس نے مجھ سے التجا کی ۔۔۔ "آپ انہیں کہیں کہ آپ کے ہاں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں، میری منگیتر مجھے بخش دیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی پیر صاحب کے جنوں سے ڈر آتا ہے۔

اس کا سر جھک گیا۔ گاڑی بہت تیز بھاگی جا رہی تھی۔ ہم پائیدان پر بیٹھے یخ ہوا کے تھپیڑے سہہ رہے تھے۔ دماغ سن ہو رہے تھے۔ ڈبے میں مسافر اونگھ یا سو رہے تھے۔ اچانک گاڑی کی گڑگڑاہٹ بہت بلند ہو گئی۔ دیکھا کہ گاڑی کسی دریا کے پل سے گذر رہی تھی۔ چاندنی رات میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ دریا میں طغیانی آئی ہوئی ہے۔ پل کا جنگلا نہیں تھا۔ ہم چونکہ گاڑی سے باہر پائیدان پر بیٹھے تھے اس لئے

پُل اور پہیوں کا شور بہت ہی بلند اور ہولناک تھا۔

گاڑی جب پُل کے وسط میں پہنچی تو میرے ساتھی کی آواز سُنائی دی ــ "اچھا دوست، خدا حافظ"۔ اور اُس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ فضا نمناک ہونے کی وجہ سے چاندنی بہت ہی شفاف تھی میں نے اُسے گٹھڑی کی طرح دریا میں جاتے دیکھا پھر اسے پانی میں گرتے ہوتے دیکھا اور گاڑی پُل عبور کر کے موڑ کاٹنے لگی۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔ ساون کی طغیانی میں دریا میں کُود کر زندہ رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ میں نے دو باتیں سوچیں اور دِل کو اطمینان ہو گیا۔ ایک یہ کہ اس آدمی نے ذہنی اذیت سے نجات حاصل کر لی ہے اور دوسرے یہ کہ اسے پیر صاحب کی توہین کی سزا ملی ہے۔ میں اس عقیدے کا قائل تھا کہ پیر صاحب جس لڑکی کے سر پہ دوپٹہ ڈال دیں اسے کوئی مرد بُری نظر سے یا ایسی نظر سے نہیں دیکھ سکتا کہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔ میں نے تو یہ بھی مان لیا تھا کہ پیر صاحب کے کسی جِنّ نے اس آدمی کو دریا میں پھینکا ہے۔

میں دل پر عجیب سا بوجھ اور تاثرات لئے کلکتے پہنچا۔ اپنا کام کیا اور دوسرے روز واپسی کے لئے گاڑی پر سوار ہو گیا۔ اس دفعہ گاڑی دن کے وقت اس دریا کے پُل پر سے گذری جس میں میرے ہمسفر نے چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بڑا ہی ہولناک سیلاب تھا۔ اس میں تو مگرمچھ بھی نہیں تیر سکتے ہوں گے، وہ تو کمزور سا انسان تھا۔ اتنی طوفانی موجوں نے اُسے پلک جھپکتے ڈبو کر مار دیا ہو گا۔

میں رانچی پہنچ گیا۔ اپنے والد صاحب کے سوا میں نے کسی کو نہ بتایا کہ فلاں گاؤں کے ایک آدمی نے دریا میں کُود کر خودکشی کر لی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی یہ شک نہ کر بیٹھے کہ اسے میں نے گاڑی سے دھکّا دیا تھا۔

بمشکل ایک مہینہ گزرا ہو گا کہ ایک صبح ہمیں شہر میں یہ اطلاع ملی

کہ رات پیر صاحب قتل ہو گئے ہیں۔ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ ان کے گھر پہنچا۔ سینکڑوں مرید جمع تھے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ عورتیں بَین کر رہی تھیں۔ کسی کو اندر نہیں جانے دے رہے تھے۔ خاص مریدوں سے پتہ چلا کہ پیر صاحب کی لاش اندر فرش پر پڑی ہے۔ جسم پہ خنجر یا چاقو کے تین زخم ہیں۔ دو گردن کے قریب اور ایک دل پر۔ پتہ چلا کہ تینوں زخم بہت گہرے ہیں۔ خاص مریدوں نے بڑے وثوق سے بتایا کہ انہیں جنّوں نے قتل کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جِنّ جس کے قبضے میں ہوں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن بوڑھوں نے بتایا کہ جو شخص جِنّوں کو حاضر کرنے کی طاقت رکھتا ہے، اسے جِنّوں سے سب سے زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ جِنّ کسی بھی وقت وار کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہی حشر ہمارے پیر صاحب کا کیا تھا۔ تمام دیہاتی خوفزدہ ہو گئے۔ اگر ان کے پیر صاحب کا یہ حشر ہو سکتا ہے تو اللہ جانے جِنّ ان پر کیا قیامت توڑیں گے؟

ہم وہاں کھڑے ہی تھے کہ پولیس آ گئی۔ پولیس کو ہندوؤں نے اطلاع دی تھی کہ مسلمانوں کا پیر قتل ہو گیا ہے۔ پاکستان میں آ کر دیکھا ہے کہ یہاں ہر روز قتل ہوتے ہیں۔ یہاں کے دیہات میں قتل کی واردات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ لوگ ایک دوسرے کو قتل کر کے بڑے جوش و خروش سے مقدمے لڑتے ہیں مگر ہمارے علاقے میں لوگوں نے قتل کا صرف لفظ سُن رکھا تھا۔ قتل کی واردات کبھی نہیں ہوتی تھی۔ پولیس کے لئے یہ مسئلہ بہت ہی سنگین تھا۔

پولیس پارٹی کے ساتھ چھ کانسٹیبل، دو تھانیدار اور ایک انگریز پولیس افسر تھا جسے لوگ کہتے تھے کہ پولیس کپتان ہے۔ بعد میں علم ہُوا کہ وہ سپرنٹنڈنٹ تھا۔ رانچی میں مستقل طور پر انگریز پولیس افسر نہیں ہُوا کرتا تھا۔ وہ دورے پر آیا ہُوا تھا۔ یہ پولیس پارٹی پیر صاحب کے گھر کے اندر چلی گئی۔ بہت دیر بعد لاش کو چارپائی پہ ڈال کر باہر لائے۔

تین چار چار پائیاں باہر بچھا دی گئیں۔ ایک چار پائی پر انگریز بیٹھ گیا اور خاص مریدوں کے بیان لیتے جانے لگے۔

انگریز افسر اُردو بہت اچھی بولتا تھا۔ اُس نے پوچھا ــــ "رات پیر کے کمرے میں کون کون تھا؟"

ایک مرید نے ذرا ہکلا کر کہا ــــ "صاحب بہادر! پیر صاحب اکیلے سویا کرتے تھے۔"

اُس کی ہکلاہٹ اتنی نمایاں تھی کہ انگریز نے اُس سے کہا ــــ "میرے قریب آؤ"۔ وہ خوفزدگی کے عالم میں انگریز کے سامنے گیا۔ انگریز نے کہا ــــ "بیٹھ جاؤ"۔ــــ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ انگریز نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور چُپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ میں قریب ہی کھڑا تھا۔ مرید کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ انگریز اُسے دیکھتا رہا اور نہایت دھیمی آواز میں بولا ــــ "وہ اکیلا نہیں تھا۔ اسے تم نے قتل کیا ہے۔ تم پھانسی چڑھو گے۔"

مرید تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگا ــــ "صاحب بہادر، میں پیر صاحب کے کمرے میں نہیں تھا۔ میں دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔"

"کمرے میں کون تھا؟"ــــ انگریز نے بدستور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی تھیں۔

قریب ایک کانسٹیبل ہاتھ میں ہتھکڑی اٹھائے کھڑا تھا۔ انگریز نے کانسٹیبل کی طرف دیکھے بغیر اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُس کے ہاتھ سے ہتھکڑی لے کر مرید کے منہ کے قریب کر کے ہلائی۔ زنجیروں کی جھنکار سے مرید جو پاؤں کے بل بیٹھا تھا پیچھے جا پڑا۔ ایک کانسٹیبل نے جُھک کر اُس کے گریبان کو پکڑا اور زور سے جھٹکا دے کر بٹھا دیا۔ انگریز نے ہتھکڑی اُس کے کندھے پر رکھ دی۔ مرید اس طرح گھبرا گیا جیسے اس کے کندھے پر سانپ رکھ دیا گیا ہو۔

"صاحب!" اُس نے ہاتھ جوڑ کر اور سخت ڈری ہوئی آواز میں کہا ــــ "دو لڑکیاں تھیں جو باری باری پیر صاحب کے کمرے میں گئی تھیں۔ ایک صرف ایک گھنٹہ ان کے ساتھ رہی تھی اور باقی تمام رات ــــ دوسری لڑکی ان کے کمرے میں سوتی تھی۔ صبح دیکھا تو یہ دوسری لڑکی غائب تھی اور پیر صاحب کی لاش فرش پر پڑی تھی"۔ــــ اس نے لڑکیوں کے نام اور ان کے باپوں کے نام اور گاؤں بھی بتا دیئے۔ (میں ان کے نام نہیں لکھ سکتا کیونکہ تمام کردار زندہ ہیں جن میں بعض ابھی تک رانچی میں رہتے ہیں اور بعض پاکستان میں آباد ہیں)۔

دو لڑکیوں کے باپ تماشائیوں کے ہجوم میں موجود تھے۔ ان میں سے دوسری لڑکی کا باپ ہجوم سے کھسک کر بھاگ نکلا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کے منگیتر نے میرے سامنے دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی۔ اس کی خودکشی کا باعث یہی لڑکی اور یہی پیر تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس لڑکی نے پیر صاحب کو قتل کر دیا ہو؟ــــ نہیں، ہمارے علاقے کا کوئی مرد بھی ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کہاں ایک کمزور سی نوجوان لڑکی کسی مرد کا خون کر دے؟

جب پولیس نے دیکھا کہ اس لڑکی کا باپ ہجوم سے نکل کر اندھا دُھند دوڑ پڑا ہے تو ایک کانسٹیبل نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ اس کے بھاگ اُٹھنے سے ہم سمجھ گئے کہ قتل میں اس کا ہاتھ ضرور ہے۔ کم بخت کو بھاگنا نہیں چاہیئے تھا۔ اسے بھی پہلے مرید کے پہلو میں انگریز افسر کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ اس کی آنکھیں ٹھہری ہوئی اور جسم کانپ رہا تھا۔ انگریز کے صحیح الفاظ مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ اُس نے اتنا ہی کہا ــــ "ہم تم سے کوئی بات نہیں پوچھیں گے۔ سارا بات تم خود بول دو۔"

انگریز افسر نے مرید کے کندھے سے لٹکتی ہوئی ہتھکڑی کی زنجیر کا ایک سرا لڑکی کے باپ کے گلے میں ڈال دیا۔ باپ اس طرح بدک کر پہلو کے بل گر پڑا جیسے ہتھکڑی نے اُسے ڈنگ مار دیا ہو۔ کہنے لگا ــــ "حضور

صاحب بہادر جناب"۔۔۔ اُس نے گھٹنوں کے بل ہو کر انگریز افسر کے پاؤں پکڑ لیے اور ہڑبڑا کر بولا۔"یہ ہٹالیں، یہ ہٹالیں حضور جناب! ہم ساری بات بتا دیں گے۔"

انگریز نے ہتھکڑی کی زنجیر پرے کر دی اور کہا۔۔۔"بولو، ٹھیک سے بولو۔"

"جناب عالی صاحب بہادر صاحب"۔۔۔ باپ ہکلا کر کہنے لگا۔۔۔

"رات کو میری بیٹی پیر صاحب کے گھر رات گذارنے آئی تھی۔ میں خود اس کے ساتھ آیا تھا۔ پیر صاحب نے مجھے بیس روپے دیے تھے اور کہا تھا کہ صبح آکر لڑکی کو لے جانا۔ میں صبح لڑکی کو لینے آیا تو پیر صاحب کی لاش دیکھی۔ اپنی بیٹی کے متعلق پوچھا تو ان لوگوں (خاص مریدوں) نے بتایا کہ تیری بیٹی شاید رات کے وقت چلی گئی تھی۔ حضور صاحب بہادر، میری بیٹی، گھر نہیں گئی۔ نہ ہی مجھے یہاں ملی۔ میں اور کچھ نہیں جانتا حضور صاحب بہادر عالی جاہ"۔۔۔ اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اُس کے رونے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ انگریز افسر کی بھی شاید یہی رائے تھی اور وہ اسے بے گناہ سمجھتا تھا کیونکہ اس نے اُسے مشتبہ افراد میں تو بٹھا لیا تھا لیکن اس سے کوئی اور بات نہ پوچھی۔ پیر صاحب کے ساتھ رات کے وقت چھ مرید رہا کرتے تھے۔ ایک انگریز کے سامنے بیٹھا تھا اور پانچ دو کانسٹیبلوں کی حراست میں کھڑے تھے۔

دوسری لڑکی کے باپ کو بلایا گیا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کے متعلق مرید نے کہا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ ایک گھنٹہ رہی تھی۔ باپ سے لڑکی کے متعلق پوچھا گیا تو اُس نے کہا کہ وہ گھر ہے۔ رات کے پہلے پہر گھر آگئی تھی۔ جو مرید انگریز افسر کے سامنے بیٹھا تھا اُس نے انگریز کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکی چلی گئی تو وہ پیر صاحب کے کمرے میں دُودھ کا پیالہ رکھنے گیا تھا۔ دوسری لڑکی کے آنے تک پیر صاحب بالکل ٹھیک تھے۔

ان تینوں کو (ایک مرید اور دو باپ) وہاں سے ہٹا دیا گیا اور پانچوں مریدوں کو اکٹھے ہی بلا کر انگریز کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ انگریز نے پانچوں کو باری باری نظر بھر کر دیکھا اور کہنے لگا کہ تم پولیس سے کوئی بات نہیں چھپا سکتے۔ اگر ساری باتیں خود بتا دو تو تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ قاتل کو سزائے موت سے بچا لوں گا اور اگر ہمیں پوری تحقیقات کر کے باتیں معلوم ہوئیں تو سب کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دوں گا۔ بتاؤ سب سے پہلے کون بولے گا۔ جو سب سے پہلے بولے گا، ہم اسے معافی دلوا کر وعدہ معاف گواہ بنا دیں گے۔

انگریز نے اُنہیں اچھی طرح سمجھایا کہ وعدہ معاف گواہ کی حیثیت کیا ہوتی ہے اور یہ بھی کہ اگر وہ واردات میں برابر کا شریک ہو تو بھی اسے سزا نہیں ملتی۔

"سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ اس گھر میں کیا ہوتا ہے"۔۔۔ انگریز افسر نے پوچھا۔

"صاحب!"۔۔۔ ہندو تھانیدار نے کہا۔۔۔"مقتول ان لوگوں کا پیر تھا۔"

"تم چپ رہو"۔۔۔ انگریز نے اُسے ڈانٹ دیا۔۔۔"میں جانتا ہوں پیر کیا ہوتا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پیر لوگ کیا کرتے ہیں۔ میں انڈیا میں دس سال سے ہوں۔"

"صاحب بہادر!"۔۔۔ ایک مرید بول پڑا۔۔۔"پیر صاحب کے قبضے میں جن تھے۔ اُنہیں جنوں نے قتل کیا ہے۔"

"سنا تم نے یہ کیا کہتا ہے؟"۔۔۔ انگریز افسر نے ہندو تھانیدار سے کہا۔۔۔"جس طرح تم ہندو لوگ ننگے سادھوؤں کی ہر بات مان لیتے ہو اسی طرح یہ مسلمان پیروں کی بات مان لیتے ہیں۔ میں نے بہت سارے پیر اور شاہ دیکھے ہیں جن کے قبضے میں جن ہیں لیکن میں نے جن کبھی نہیں دیکھے۔"

انگریز نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مریدوں سے کہا — "ادھر کوئی جن نہیں تھا۔ سچ سچ بتاؤ کہ اس گھر میں کیا ہوتا تھا۔ تم سب بدمعاش ہو۔ قتل کی سزا بعد میں ملے گی، پہلے بدمعاشی کی سزا دلواؤں گا۔ اگر صحیح بات بتا دو تو بدمعاشی میں گرفتار نہیں کروں گا۔"

مریدوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک نے آہستہ سے کہا — "اندر چل کر دکھا دو۔ ہم پرائے گناہ کی سزا کیوں بھگتیں؟"

انگریز اُٹھ کھڑا ہوا اور مریدوں سے مخاطب ہو کر بولا "چلو اندر اور ہر ایک چیز دکھاؤ" — اس نے ہم سب کی طرف دیکھا۔ میں پاس ہی کھڑا تھا۔ میں شہر میں رہنے کی وجہ سے ذرا اچھے لباس میں تھا۔ انگریز نے مجھ سے کہا — "تم بھی اندر چلو اور دیکھو کہ یہ لوگ تمہیں کیا دکھاتے ہیں"۔ میں ڈر گیا۔ اُس نے کہا "ہم تمہیں گواہ بنائیں گے۔"

میری طرح اس نے تین اور آدمی ساتھ لئے۔ دو شہر کے ہندو تھے جو پولیس کے ساتھ ہی آتے تھے اور ایک ہمارے دیہاتی علاقے کا ہندو مکھیا تھا جس طرح پاکستانی دیہات میں نمبردار ہوتے ہیں۔

مرید ہم سب کو اس کمرے میں لے گئے جہاں میں نے پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ مسند وہیں تھی اور اس کے قریب پانی کا ٹب رکھا تھا۔

انگریز نے پہلا سوال یہ کیا "یہ ٹب یہاں کیوں رکھا ہے؟"

ایک مرید آگے بڑھا۔ اُس نے ایک اور کو بلایا اور اُسے کہا — "اٹھا کر ایک طرف کر دو۔"

دونوں نے ٹب کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔

مرید نے کہا — "صاحب بہادر، اس ٹب کے نیچے سے جنوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔"

انگریز نے آگے ہو کر دیکھا پھر ہم چار گواہوں سے کہا — "تم بھی آ کر دیکھو۔"

ہم نے دیکھا۔ وہاں چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں ایک لاؤڈ سپیکر رکھا تھا۔

"صاحب بہادر" — ایک مرید نے کہا — "اس میں سے جن بولیں گے۔"

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ صاحب بہادر کو سارا تماشہ دکھا دو۔

چار مرید دوسرے کمرے میں چلے گئے اور پانچ سات منٹ بعد لاؤڈ سپیکر سے بنسری، ستار اور گھنگھروؤں کی وہی دُھن سنائی دینے لگی جس نے مجھ پر جادو کر کے مجھے پیر صاحب کا مرید بنا دیا تھا مگر اس روز اس دُھن میں وہ جادو نہیں تھا بلکہ ایک ڈراؤنا سا تاثر تھا۔

دُھن خاموش ہو گئی اور آواز آئی — "اب جن بولیں گے۔"

لاؤڈ سپیکر میں سے دھیمی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے بہت دُور بیٹھی کوئی عورت یا کوئی بچہ بول رہا ہو۔ یہ آوازیں بھی خاموش ہو گئیں اور چاروں مرید دوسرے کمرے سے آ گئے۔ ایک نے کہا — "یہ ساز ہم بجا رہے تھے اور جنوں کی طرح یہ بولا تھا" اس نے اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے کہا کہ یہاں کے دیہاتی انہی آوازوں کو جنوں کی آوازیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ آوازیں پانی سے نکلتی ہیں۔

اس نے لپک کر تکئے کے نیچے ہاتھ پھیرا اور کہا "صاحب بہادر، اب ہم جنوں کو جلائیں گے" اس نے ہاتھ ٹب کی طرف جھٹکا تو پانی کی سطح پر کئی شرارے چمکے۔

انگریز افسر نے تکیے کو ایک طرف کیا اور نیچے سے دانے سے اُٹھا کر ہمیں دکھاتے۔ مجھ سے پوچھنے لگا — "آپ بھی اس پیر کے مرید تھے؟"

میں نے کہا "میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں بھی ان آوازوں کو جنوں کی آوازیں سمجھتا رہا۔ میں تو اس پیر کا خاص عقیدت مند تھا۔"

اُس نے مجھ سے تعلیم کے متعلق پوچھا تو میں نے بتایا کہ دس جماعتیں پاس ہوں۔ اُس نے پوچھا کہ سائنس پڑھی تھی؟ میں نے کہا کہ نہیں۔

"تم پڑھے لکھے آدمی اس چیز کو نہیں پہچانتے تو جنگلی لوگ کیا پہچانیں گے"۔ اس نے کہا "دیکھو اسے سوڈیم کہتے ہیں۔ اسے پانی میں

پھینکو تو یہ جلتی ہے۔"

میں اپنی اُس وقت کی ذہنی حالت کو بیان کر کے کہانی کو بے مزہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اصل کہانی سُنانا چاہتا ہوں۔ وہاں سے مرید ہمیں اس کمرے میں لے گئے جہاں وہ لڑکیاں جایا کرتی تھیں جن کے سروں پر پیر صاحب خاص دوپٹہ ڈالا کرتے تھے۔ بہت خوبصورت اور سجا ہوا کمرہ تھا۔ فرش پر خون ہی خون تھا۔ انگریز نے ہمیں کہا کہ ہم دروازے سے آگے نہ آئیں تاکہ ملزموں کے پاؤں کے نقوش (کھُرے) مٹ نہ جائیں اور یہ بھی کہ ہم کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔

کمرے میں ایک پلنگ تھا جس پہ پھولدار چادر بچھی تھی اور ریشمی غلاف والے دو تکیے رکھے تھے۔ دیواروں کا رنگ دلفریب تھا۔ ایک مرید نے بتایا کہ لڑکی کو اس کمرے میں لاکر دُودھ پلایا جاتا تھا جس میں ایک بے ذائقہ سفوف ملا ہوتا تھا۔ اس سے لڑکی پر نشہ طاری ہو جاتا تھا۔ اسے ستار اور بنسری کی دھن سنائی جاتی تھی اور ایک آدمی آہستہ آہستہ پریوں کی ایسی طلسماتی سی باتیں کرنے لگتا تھا کہ نشے کی حالت میں لڑکی کو فی الواقعی پریاں دکھائی دینے لگتی تھیں۔ اسی کیفیت میں پیر صاحب لڑکی کی آبرو سے کھیلتے تھے۔

مریدوں نے رہنمائی کی اور ہمیں ایک اور کمرے میں لے گئے جہاں ایک ستار، ایک بنسری اور گھنگھرو رکھے تھے۔ ایک کونے میں مائیکروفون پڑا تھا جو بیٹری سے کام کرتا تھا۔ یہ ساز مائیکروفون سے دُور رکھ کر اور لاؤڈ سپیکر کی آواز بہت مدھم کر کے بجائے جاتے تھے۔ اسی لئے ٹب کے نیچے سے آنیوالی آوازیں یوں لگتی تھی جیسے بہت دُور سے آ رہی ہو۔

میں نے والد صاحب کے سوا کسی سے ذکر نہ کیا تھا کہ اس آدمی نے میرے سامنے خودکشی کر لی تھی۔ پولیس اب اس آدمی اور لڑکی کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ مریدوں کو تو پولیس نے حوالات میں بند کر رکھا تھا۔ تھوڑے سے ہی عرصے بعد پولیس نے ان مریدوں کو نوسربازی اور بدمعاشی کا اڈہ چلانے کے جرم میں سال سال کے لئے جیل بھجوا دیا اور قتل کی تفتیش جاری رکھی مگر لڑکی کا سراغ نہ مل سکا۔

اس کمرے میں ایک صندوق رکھا تھا جس میں سے مریدوں نے سفوف کا ڈبہ نکال کر دکھایا۔ پھر ہمیں دو اور کمرے دکھاتے گئے۔ ایک میں مریدوں کے بستر بچھے ہوتے تھے۔ لکڑی کے ایک بکس میں سے دیسی شراب کی کئی بوتلیں اور دو بوتلیں ولائتی شراب کی برآمد ہوئیں اور ایک اور صندوق میں سے پیر صاحب کے کپڑوں کے نیچے سے ریوالور برآمد ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہ انکشاف بھی ہوا کہ پیر صاحب کلکتے کے بدمعاش تھے اور بیس برس کی عمر میں اُنہوں نے نوسربازی کے جرم میں چھ مہینے کی پہلی سزائے قید بھگتی تھی۔ دو سال بعد ایسی ہی ایک اور واردات میں گرفتار ہوتے اور ایک سال سزا ملی۔ پھر ان کا نام پولیس کے رجسٹر میں لکھ لیا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں نوسربازی اور اداکاری کے فن میں کمال حاصل کر کے پیر صاحب کے یہاں آکر ڈیرے جما ئے۔ یہ چھ کے چھ خاص مرید آسن سول اور کلکتے کے جرائم پیشہ

دیہاتیوں پر دہشت طاری تھی۔ وہ اب بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ ان کا پیر ایک فریب کار انسان تھا کیونکہ اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے تو دیکھا ہی نہیں تھا کہ پیر کے گھر سے کیا کچھ برآمد ہوا ہے۔ میں اکیلا مسلمان تھا جس نے یہ ڈرامہ دیکھا تھا۔ میں جس سے بات کرتا وہ مجھ پر برس پڑتا۔ مجھے کئی ایک دیہاتیوں نے گالیاں بھی دیں اور کہا کہ تم ایک انگریز اور ہندوؤں کی باتوں میں آگئے ہو۔ کسی نے کہا کہ تم کافروں کے مُخبر ہو۔ پیر صاحب کو تو جنّوں نے مارا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ میں پاکستان بن گیا۔ رانچی ہندوؤں کا علاقہ تھا۔ بھلا وہاں مسلمانوں کو کیسے پناہ ملتی۔ ہم رانچی سے گاڑی میں بیٹھے اور آسن سول پہنچے۔ ارادہ تھا کہ مشرقی پاکستان چلے جائیں گے مگر وہاں مسلمان کا ارادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔ مسلمان اُدھر ہی کو چلے جا رہے تھے جدھر کی گاڑی مل جاتی تھی۔ آسن سول کے ریلوے سٹیشن کے اندر ہم محفوظ تھے۔ باہر کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی لاشیں بکھری ہوتی تھیں۔ میں نے پلیٹ فارم پر اُسی انگریز پولیس افسر کو بھاگتا دوڑتا دیکھا۔ پلیٹ فارم پر مسلمان کنبوں کے ہجوم

افراد تھے۔

جتنی اشیاء برآمد کی گئیں، ان کا مشیر نامہ تیار کیا گیا جس پر ہم چار آدمیوں نے دستخط کئے۔ چھ مریدوں اور دونوں لڑکیوں کے باپوں کو جو آخری رات پیر صاحب کے خصوصی کمرے میں گئی تھیں پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔

اس کے بعد تحقیقات ہوتی رہی مگر تلاش کے باوجود اس لڑکی کا سراغ نہ مل سکا جس کے منگیتر نے خودکشی کر لی تھی۔ اس آدمی کا بھی کئی بار نام لیا گیا۔ اس کے والدین یہی کہتے رہے کہ وہ ایک مہینہ پہلے گھر سے لاپتہ ہو گیا تھا۔

بیٹھے گاڑیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اس انگریز کے ساتھ پولیس کی خاصی جمعیت تھی اور یہ اسی کا کارنامہ تھا کہ سٹیشن کی حدود کے اندر مسلمان محفوظ تھے۔ وہ ایک تھانیدار کو ساتھ لئے قریب سے گذرا تو کہہ رہا تھا "جو اِدھر گڑبڑ کرے فوراً گولی مار دو۔"

اتفاق سے گاڑی آگئی مگر یہ گاڑی کلکتے جا نہیں رہی تھی بلکہ کلکتے سے آ رہی تھی۔ اس میں بے تحاشہ بھیڑ تھی۔ پناہ گزینوں نے گاڑی پر ہلّہ بول دیا۔ کوئی سوار ہو سکے کوئی رہ گئے اور گاڑی چل پڑی۔

اس گاڑی نے ہمیں بھوکا پیاسا امرتسر پہنچا دیا۔ لیکن ایک ہفتہ گذر گیا تھا۔ گاڑی جہاں رُکتی تھی، رُکی ہی رہتی تھی۔ راستے میں گاڑی پر ہندوؤں اور سکھوں نے گولیاں بھی چلائیں اور کئی مسلمان بھی شہید ہو گئے۔ مشرقی پنجاب میں تو ریلوے لائن کے ساتھ لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ میں نے کئی لاشیں دیکھیں جن کے سر، بازو یا ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ گاڑی کے نیچے آ گئے ہوں۔

گرتے پڑتے ہم پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئے اور رانچی کے مسلمان سارے پاکستان میں بکھر گئے۔ دس سال گزر گئے۔ ہم اپنے کاروبار میں لگ گئے اور اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۵۷ء کا ذکر ہے۔ میں فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ سامنے سے ایک آدمی آ رہا تھا۔ وہ مجھے بڑے غور سے

دیکھ رہا تھا۔ صورت جانی پہچانی سی لگی۔ میں نے سوچا کہ رانچی کا کوئی آدمی ہو گا۔ شاید ہماری دکان پہ آتا رہتا ہو گا۔ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو دونوں رُک گئے۔

اُس نے مجھے گھور گھور کر دیکھا اور بولا "معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو راستے میں روک لیا ہے۔ آپ رانچی کے مہاجر تو نہیں ؟" "ہاں" میں نے کہا۔ "میں رانچی کا مہاجر ہوں۔۔۔۔ آپ نے ہماری دکان دیکھی ہو گی؟ آپ ہماری دکان میں آتے رہتے ہوں گے۔"

"نہیں" — اُس نے مسکرا کر کہا — "میں نے آپ کے ساتھ ہوڑا ایکسپریس کے پائیدان پر سفر کیا تھا۔ وہ رات کا سفر آپ بھول گئے ہیں ؟"

میں بھلا اتنی ہولناک واردات کیسے بھول سکتا تھا؟ میں نے اُسے غور سے دیکھا تو پہچان لیا مگر یہ یقین نہ آیا کہ طغیانی کی لہروں میں کُود جانے والا انسان زندہ ہو سکتا ہے۔

"آپ کی حیرت بجا ہے" — اُس نے کہا — "وہ میں ہی تھا جس نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی لیکن میں مرا نہیں تھا۔"

"کیا دریا میں پانی کم تھا؟"

"پانی بہت گہرا اور سیلابی تھا" — اُس نے کہا — "اگر پانی کم ہوتا تو شاید میں اپنے آپ کو ڈبو دیتا" — اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو چھوٹے سے ایک ہوٹل کی طرف اشارہ کر کے بولا — "آیئے، چائے پئیں گے اور باتیں کریں گے۔"

ہوٹل میں اُس نے چائے منگوائی اور ایک ایسی کہانی سنائی جس نے مجھے اُن قوتوں کا قائل کر دیا جو خُدا نے انسان کو عطا کی ہیں مگر انسان ان سے بے خبر ہے۔ میں اسی کو ایمان کی قوت کہتا ہوں۔

اس نے کہانی جن الفاظ میں سنائی تھی، میں انہی الفاظ کو ذرا بنا سنوار کر اپنی زبان میں پیش کرتا ہوں۔ وہ کوئی ایسا پڑھا لکھا آدمی نہیں۔ پاکستان میں آ کر اس نے باقاعدہ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ اس سے پہلے وہ صرف قرآن پڑھ سکتا تھا یا پہلی جماعت کا قاعدہ لیکن کھیتی باڑی میں اُلجھ کر قاعدہ

بھی بند ہوگیا تھا۔ اُس نے اپنی کہانی سیدھے سادے طریقے سے سُنا ڈالی تھی لیکن طغیانی میں ڈوبتے وقت اس کے اندر جو انقلاب آیا، وہ اس کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھا کیونکہ اس کا علم محدود تھا۔

قصّہ یُوں ہُوا کہ اُس کی اپنی رائے کے مطابق وہ ایک بُزدل انسان تھا۔ اُس نے بچپن سے لے کر دریا میں کُودنے تک کے کئی واقعات سُنائے جو ثابت کرتے تھے کہ اُس کا دل بہت ہی کمزور تھا اور اُس پر ہر وقت انجانا سا خوف طاری رہتا تھا۔ روزمرّہ زندگی کے عام سی قسم کے واقعات بھی اُسے خوفزدہ کر دیا کرتے تھے۔ وہ دو چار مردوں کی محفل میں بیٹھنے سے بھی کتراتا تھا۔ خاموش طبع انسان تھا جسے خوف اور احساسِ کمتری نے چلتی پھرتی لاش بنا رکھا تھا۔ ایسے انسان میں اتنی جرأت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ ایک نوجوان لڑکی سے اظہارِ محبت کرے۔ یہ تو وہ لڑکی ہی بتا سکتی ہے کہ اسے اس انسان کی کون سی ادا بھا گئی تھی کہ اسے چاہنے لگی تھی اور چاہا بھی اتنا کہ اپنی دُنیا کے بادشاہ اور جنوّں اور پریوں کے شہنشاہ تک کو ٹھکرا دیا۔ اس آدمی نے زندگی کا پہلا اور سب سے بڑا جرأت مندانہ کارنامہ یہ کیا کہ لڑکی کی محبت کو قبول کر لیا اور اسے چوری چھُپے ملتا رہا مگر اس محبت کا جو حشر ہُوا وہ میں بیان کر چکا ہوں۔

پیر کے جنّوں سے وہ اس قدر خوفزدہ ہوگیا تھا کہ راتوں کو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا تھا اور اسے اپنے کمرے میں جن اور بھُوت نظر آنے لگتے تھے۔ وہ رات رات بھر خوف کے مارے کانپتا رہتا تھا۔ دِن کے وقت وہ پیر کے مریدوں سے بھی ڈر جاتا تھا۔ دوسری طرف لڑکی نے محبت کے واسطے دے دے کر اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں مگر وہ اکیلا ہی بھاگ اُٹھا اور زندگی کے جھمیلوں سے ہی بھاگ گیا۔

جب وہ دریا میں گِرا تو، اُس کے بیان کے مطابق، وہ پانی میں دُور نیچے تک چلا گیا۔ اُس نے محض اتفاق سے منہ بند رکھا اور سانس بھی روک لیا تھا جس سے پانی اس کے پیٹ اور پھیپھڑوں میں نہ جا سکا۔ وہ کہتا ہے کہ

وہ طغیانی کے زور سے یوں سطح پر اُبھر آیا جیسے کسی غیبی قوّت نے گھسیٹ کر باہر نکال لیا ہو۔ سطح پر آ کر اس نے گہری سانس لی۔ ایک غضب ناک مَوج نے اُسے دبوچ کر اوندھے منہ ایسی ڈبکی دی کہ وہ پھر تہہ کی طرف جانے لگا لیکن نیچے سے پانی کے زور نے اُسے پھر سطح پر دھکیل دیا۔ طغیانی کا شور اس کے دل و جگر کو چکنا چُور کر رہا تھا اور ٹھنڈے پانی سے دماغ کی نسیں سُن ہو رہی تھیں۔ سطح پر آ کر اُس نے پھر گہری سانس لی۔ طغیانی اسے بہت تیزی سے بہاتے لئے جا رہی تھی۔

ایک اور چٹان جیسی لہر نے غرّا کر اسے پھر ڈبکی دی لیکن اسی لہر نے اسے پانی سے اُٹھا کر سطح پر اُچھال دیا۔ وہ سانس لے ہی رہا تھا کہ وہ یوں ایک ہی مقام پر گھومنے لگا جیسے بچے لٹّو کو گھماتے ہیں۔ یہ ایک بھنور تھا۔ بھنور کا عالم یہ ہوتا ہے کہ گھومتا ہُوا پانی تہہ کی طرف جاتا ہے اور اس کی لپیٹ میں ہاتھی آ جاتے تو اسے بھی تہہ میں لے جا کر مار دیتا ہے لیکن یہ آدمی ہاتھی نہیں بلکہ دُبلا پتلا انسان تھا، وہ غالباً بھنور کی تیز رفتار گردش سے دُور جا پڑا، مگر جو چکر اس نے کھاتے تھے ان سے اس کا سر ڈولنے لگا۔

ایک اور لہر اسے اُوپر اُٹھا لے گئی جہاں اس نے گہری سانس لی اور یہ تھا وہ موقع جب اس کا خوف جو ساری عمر اس کے دل پر سوار رہا تھا ایک قوّت بن گیا۔ اس نے تو مرنا چاہا تھا لیکن موت سامنے آئی تو اس نے دیکھ لیا کہ کوئی قوّت اسے اٹھا اٹھا کر موت کے منہ سے دُور پھینک رہی ہے۔ اس پر موت کا خوف طاری ہُوا تو وہ موت سے بھاگنے لگا پھر اسے یقین سا ہو گیا کہ وہ موت کو شکست دے سکتا ہے۔ اُس نے اپنے بازوؤں کے زور سے تیرنے کی کوشش کی تو محسوس کیا کہ طغیانی اسے کنارے تک نہیں پہنچنے دے گی۔

رات چاندنی تھی جس میں اسے لہروں کی بھاگتی دوڑتی چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ اگر اندھیرا ہوتا تو وہ کبھی کا ڈوب چکا ہوتا کیونکہ اندھیرے کا اثر ایسا ہوتا ہے جو کمزور دل انسان کی آدھی قوّت سلب کر لیتا ہے۔ اس آدمی کو کنارے کے درخت دکھائی دے رہے تھے جو اسے حوصلہ دے رہے

تھے کہ کنارا دُور نہیں۔ درختوں کی صورت میں اسے اپنی زندگی کنارے پر کھڑی دکھائی دے رہی تھی جسے دیکھ کر اس نے موت کے خلاف فیصلہ کُن جنگ شروع کر دی۔

جب اس نے اپنے زور پر تیرنا شروع کیا تو سیلابی موجیں اس کے مقابلے پر اُتر آئیں۔ اس نے بلند آواز سے کہا ـــ "مَیں نکل جاؤں گا۔ اب نہیں ڈروں گا۔"

اس نے اپنی آواز سے حوصلہ لیا اور کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ لہروں نے اسے اُٹھا اُٹھا کر ڈبکیاں دیں۔ اُس نے ہر بار اُبھر کر چلّا چلّا کر کہا ـــ "مَیں نکل جاؤں گا۔ اب نہیں ڈروں گا۔"

اسے دراصل وہ قوّت حوصلہ دے رہی تھی جو اسے پانی کے نیچے سے اُٹھا کر سطح پر لے آتی تھی۔ یہ طغیانی کی خاصیّت ہوتی ہے کہ پانی لہریں بن کر اُوپر اُٹھتا ہے، اُوپر سے نیچے جاتا ہے اور تہہ سے ٹکرا کر پھر اُوپر آتا ہے۔ اگر انسان حوصلے کو ہاتھ سے نہ جانے دے تو وہ طغیانی میں اتنی جلدی نہیں ڈوب سکتا۔ یہ طغیانی کی صرف دہشت ہوتی ہے جو انسان کی قوتوں کو مفلوج کر کے اسے ڈبو دیتی ہے۔ میرا دوست اس خاصیّت سے آگاہ نہیں تھا۔ اس نے یہی کمال کر دکھایا کہ حوصلے اور استقلال کو دل میں بیدار کر لیا۔

وہ ڈبکیاں کھاتا رہا اور اُبھر اُبھر کر تیرتا بھی رہا۔ اسے یاد نہیں کہ وہ کتنی دیر طغیانی اور موت سے لڑتا رہا۔ ایک بار پھر وہ تہہ کی طرف گیا تو نیچے سے اسے دھچکا لگا۔ اس نے پاؤں کے نیچے زمین محسوس کی اور یہ بھی دیکھا کہ اس کے کندھے، منہ اور سر پانی سے باہر ہیں۔ وہ رُک کر کھڑا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے سے پتہ چلا کہ یہاں دریا بہت چوڑا ہو گیا ہے اور پانی اس قدر پھیل گیا ہے کہ گہرائی بھی ختم ہو گئی ہے اور پانی کا زور بھی ٹوٹ گیا ہے۔ اس کا جسم ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ وہ کھڑا رہنے کے قابل نہیں تھا لیکن ابھی اس کی جنگ ختم نہیں ہوتی تھی۔ وہ کنارے کی طرف چل پڑا۔ پانی کم گہرا ہوتے

ہوتے پھر گہرا ہو گیا جہاں وہ کندھوں تک ڈوب گیا۔

وہ کہتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا کہ ایسا کیوں ہُوا کہ میں نے زور سے قہقہہ لگایا اور پانی میں چلتا چلا گیا۔ جب پانی منہ تک آیا تو میں تیرنے لگا۔ جسم کے جوڑ جوڑ سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں، میں پھر بھی تیرتا رہا اور آگے جا کر پانی کمر تک آ گیا اور میں پانی میں چلتا کنارے پر پہنچ گیا۔

وہ علاقہ جنگلاتی ہے۔ موسم گرما تھا۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں چلا گیا اور گر پڑا۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ بیہوش ہو گیا تھا یا سو گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو سُورج بہت اُوپر اُٹھ آیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بھاگے جا رہے تھے۔ اُس نے کپڑے اُتار کر دھوپ میں پھیلا دیئے اور پھر لیٹ گیا۔ وہ بہت سو چکا تھا اس لئے اسے نیند نہ آئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ بہت نڈر اور دلیر انسان بن گیا ہے۔ اسے سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ وہ موت کو شکست دے چکا ہے۔ اب وہ پیر کے جنّوں کو بھی شکست دے سکے گا۔ اس نے سکیم بنالی جس سے اُسے اس قدر حوصلہ حاصل ہُوا کہ اس کی تھکن دُور ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ کوئی قوّت اس کے ساتھ ہے جس کے سامنے خوف اور وہم کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا تو آسمان بہت ہی خوبصورت نظر آیا پھر اسے زمین کی ہریالی بھی بہت حسین لگی۔

شام سے پہلے پہلے اُس کے کپڑے خشک ہو گئے۔ اب اسے بھوک ستا رہی تھی۔ اس کی جیب میں پانچ روپے کا ایک نوٹ اور دو نوٹ دو دو روپے کے تھے۔ دیکھا کہ تینوں نوٹ جیب میں موجود تھے جو اس نے دھوپ میں پھیلاتے تو خشک ہو گئے۔ اس نے کپڑے پہنے اور چل پڑا۔ قریب کے ایک گاؤں میں گیا جہاں مسلمانوں کے ایک گھر چلا گیا اور جھوٹ بولا کہ وہ پیدل ہی ایک گاؤں جا رہا تھا کہ شام ہو گئی۔

اس گھرانے نے اسے کھانا بھی دیا اور رات بھر مہمان بھی رکھا۔ صبح

ناشتہ کر کے وہ پھر چل پڑا اور اس طرح دوسری شام آسن سول پہنچ گیا۔ وہ اب ایک ارادہ دل میں لئے ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے ریلوے سٹیشن پر قلی کا کام کیا۔ منڈی میں بھی سامان اور بوریاں اٹھاتا رہا اور رات ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں سوتا رہا۔

تقریباً ایک مہینے کی محنت مزدوری سے اس کے پاس پچاسی (۸۵) روپے جمع ہو گئے۔ وہ رانچی جانے والی چھوٹی ریل گاڑی میں بیٹھا اور شام کے وقت رانچی پہنچ گیا۔ اس عرصے میں اس نے داڑھی بڑھالی تھی جس سے اس کی پہچان ذرا مشکل ہو گئی تھی۔ اس نے پاجامے کے اندر ران کے ساتھ ایک چاقو باندھ رکھا تھا جس کا پھل چھ انچ لمبا تھا۔

رات کے اندھیرے میں وہ اپنے گاؤں کے قریب جنگل میں جا پہنچا۔

اسے معلوم تھا کہ اس کی منگیتر کہاں اور کس وقت مل سکتی ہے۔ اس کے گاؤں سے تھوڑی دُور ایک نشیبی خطہ تھا جہاں ڈھور ڈنگر چرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس کی منگیتر اکثر وہاں جایا کرتی تھی مگر اب مشکل یہ آپڑی تھی کہ اس کی منگیتر پیر صاحب کی منظورِ نظر بن کر شہزادی بن گئی تھی اس لئے وہ ڈھور ڈنگروں کے ساتھ باہر نہیں جاتی تھی۔

اس آدمی کو وہاں اپنی منگیتر کا چھوٹا بھائی مل گیا۔ اسے اپنے پاس بلایا تو یہ بچہ اسے ایک تو داڑھی کی وجہ سے پہچان نہ سکا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے منہ اور سر چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے بچے سے کہا کہ پیر صاحب اس طرف سیر کے لئے جا رہے ہیں، اپنی بہن سے کہو کہ تمہیں پیر صاحب نے یہیں بلایا ہے۔ وہ اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ بچہ بھاگا گیا۔ یہ آدمی ڈر رہا تھا کہ لڑکی کے ساتھ گھر کا کوئی مرد نہ آجائے لیکن لڑکی اکیلی آگئی۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ لڑکی اسے پہچان نہ سکی۔ اس آدمی نے بچے کو وہیں روک دیا اور لڑکی سے کہا کہ پیر صاحب اُدھر کھڑے ہیں۔

اوٹ میں لے جا کر اُس نے سر سے چادر ہٹا دی۔ لڑکی نے اسے

پہچان لیا۔ باتیں ہوئیں تو لڑکی نے بتایا کہ وہ اب بھی اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہے۔ اس نے اس آدمی کو رو رو کر بڑی ہی دردناک کہانی سنائی کہ پیر نے اسے نشہ پلا پلا کر کس حال تک پہنچا دیا ہے۔ وہ آگ بگولہ ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آدمی بھی انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ اب وہ بزدل انسان نہیں تھا۔ وہ تو پیر کے جنوں کا مقابلہ کرنے آیا تھا۔ لڑکی نے اُسے بتایا کہ وہ آج پیر کے ہاں جا رہی ہے۔ اس آدمی نے اسے بتایا کہ وہ اسے رات پیر کے کمرے میں ملے گا۔ دونوں نے سکیم بنالی کہ یہ آدمی کس طرح اس کمرے میں داخل ہو گا تاکہ اسے کوئی دیکھ نہ لے۔

رات کے وقت لڑکی پیر کے خاص کمرے میں بیٹھی تھی۔ اسے دُودھ کا پیالہ پیش کیا گیا تو اس نے پیر کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "اب اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو آپ کی ہوں۔ بھاگ تو نہیں جاؤں گی۔" پیر شراب کے نشے میں بدمست تھا اس نے دُودھ کا پیالہ الگ رکھ دیا۔ لڑکی نے کہا کہ کمرے میں گھٹن ہے۔ ذرا یہ کھڑکی کھول دیں۔ چنانچہ اس نے کھڑکی کھول دی۔ یہ کھڑکی صحن کی طرف کھلتی تھی جس کی باہر والی دیوار زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ پیر کے خاص مرید یہ دیکھ کر کہ پیر صاحب لڑکی کے ساتھ مگن ہو گئے ہیں، سو گئے تھے یا نشے میں بدمست تھے۔

پیر پلنگ پر بیٹھا تھا۔ اس نے لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا، عین اُس وقت لڑکی کا منگیتر کھڑکی میں سے کُود کر کمرے میں آگیا۔ پیر حیران ہو کر اسی قدر کہہ سکا — "کون ہو؟" — اسے چاقو کے بھرپور وار کی صورت میں جواب ملا۔

چاقو کا پھل گردن کے قریب سے ہوتا ہوا پھیپھڑے تک اُتر گیا تھا۔ لڑکی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چاقو کا دوسرا وار گردن کے دوسری طرف پڑا۔ وہ بھی دُور اندر تک اُتر گیا۔ پیر اُٹھا تو چاقو کا تیسرا وار اس کے دل پر پڑا اور وہ فرش پر گر پڑا۔ اس کی آواز نہ نکل سکی۔ پیر کی مدد کے لئے کوئی جن نہ آیا۔

یہ آدمی لڑکی کو ساتھ لیتے کھڑکی میں سے باہر نکلا۔ صحن والی دیوار سے اسے اُوپر اُٹھایا اور خود بھی دیوار پھلانگ گیا۔ دونوں جنگل میں غائب ہو گئے۔ اس علاقے میں گاؤں بہت کم ہوتے تھے اور نشیب و فراز زیادہ۔ دونوں نے ایک ندی میں کپڑے دھوئے اور گیلے کپڑے پہن کر چل پڑے۔ صبح تک وہ بہت دور نکل گئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔ کپڑوں پر خون کا ہلکا سا دھبہ بھی نہیں رہا تھا۔ قریب ہی چھوٹا سا ایک ریلوے سٹیشن تھا۔ وہ سٹیشن کے باہر گھومتے پھرتے رہے۔ بہت دیر بعد آسن سول جانے والی گاڑی آ گئی۔ انہوں نے ٹکٹ لئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ لڑکی اپنے ساتھ کچھ رقم لے آئی تھی۔ کچھ رقم اس کے منگیتر کے پاس تھی۔ انہوں نے دلی کے ٹکٹ لئے اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے آخر تک دونوں نے نئے بننے والے مکانوں اور عمارتوں کی مزدوری کی۔ شادی بھی کر لی اور اگست کے آخر میں دلی سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ یہاں بھی انہوں نے محنت مزدوری کی۔ جب تھوڑے سے پیسے جمع ہو گئے تو پان سگریٹ کا خوانچہ لگانے لگے جو بڑھتے بڑھتے پان سگریٹ کا کھوکھا بن گیا۔ اب ان کی اچھی خاصی دکان ہے۔ چار بچے ہیں اور فارغ البالی ہے۔

"کیا اب بھی آپ پیروں کے معتقد ہیں؟"۔۔۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں پیر کی لاش اور اس کے گھر سارا ڈرامہ دیکھ آیا ہوں"۔۔۔ میں نے اسے قتل کے بعد کی ساری باتیں سُنا ڈالیں۔

جب بیٹا جوان ہُوا

احسن علی زیدی

احمد یار خان صاحب نے ایک کہانی سنائی تھی جس میں ایک ہندو لڑکی در پردہ مُسلمان ہو گئی تھی لیکن وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہندوؤں کی طرح رہتی تھی۔ میں آپ کو ایک سچی کہانی سُناتا ہوں جس میں ایک آدمی نے ایک کنواری لڑکی کے ساتھ خفیہ شادی کی تھی اور وہ اپنے اپنے گھر رہتے تھے۔ لڑکی کے والدین نے لڑکی کی شادی ایک اور آدمی کے ساتھ کر دی۔ میں بالکل نہیں جانتا کہ خفیہ طور پر مسلمان ہونے والی لڑکی اور خفیہ طور پر شادی کرنے والی لڑکی کی قانونی پوزیشن کیا ہوتی ہے اور شریعت کا قانون کیا کہتا ہے۔ جذبات کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ خون خرابے جذبات کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ احمد یار خان صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ انسان کی فطرت ایک مُعمّہ ہے جسے کوئی انسان حل نہیں کر سکتا۔ اس کے اندر ایسے جرائم پرورش پاتے ہیں کہ ایسا ایک بھی جرم کر دے تو دنیا حیران رہ جائے۔۔۔ میں آپ کو ایسا ہی ایک جُرم سُناتا ہوں۔

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے اور آزادی (اگست ۱۹۴۷) کے درمیانی عرصے میں ایک صبح انبالہ چھاؤنی سے دو اڑھائی میل دُور ایک جوان لڑکی کی لاش پڑی دیکھی گئی۔ وہاں بھنگ کی گھنی جھاڑیاں تھیں اور اس زمانے میں وہ علاقہ ویران ہُوا کرتا تھا۔ لڑکی ایک مسلمان ٹھیکیدار کی بیٹی تھی۔ اس کا اصل نام لکھنا مناسب نہیں۔ اسے حلیم کہہ لیں۔ وہ چونکہ بڑے پیمانے کا ٹھیکیدار تھا

اس لئے فوجی اور شہری افسروں پر اس کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ اس نے ان افسروں کی معرفت پولیس کو مجبور کر دیا کہ تفتیش میں اور ملزموں کو گرفتار کرنے میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ پولیس نے کس طرح تفتیش کی۔ میں اس کیس سے اس طرح واقف ہوا کہ ایک روز کنور دلیپ نام کے ایک ہندو پولیس انسپکٹر سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ وہ وردی میں نہیں تھا اور اسے انبالہ میں بھی نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ وہ سپیشل پولیس میں تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔ اُس نے بتایا کہ ایک ٹھیکیدار کی جوان بیٹی قتل ہو گئی ہے اور اس کی تفتیش سپیشل پولیس کے حوالے کی گئی ہے۔ اس روز کے بعد کنور دلیپ کے ساتھ ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ مجھے اس قتل کے متعلق باتیں سناتا رہا۔ اس طرح میں اس عجیب و غریب واردات سے اول تا آخر واقف ہو گیا۔ میں یہ گزارش کرتا ہوں کہ یہ کہانی پڑھتے وقت مجھے احمد یار خان نہ سمجھ لیں میں پولیس انسپکٹر نہیں ہوں۔ میں نے جو دیکھا اور جو سُنا وہ سنا رہا ہوں، اور اس یقین کے ساتھ سُنا رہا ہوں کہ یہ کہانی سچی ہے۔ میں نے ملزموں کو بھی دیکھا تھا۔

لڑکی کی یہ لاش اس حالت میں تھی کہ اس کے گلے میں رسّی بندھی ہوئی تھی۔ اسی رسّی نے اس کی جان لی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی زیور نہیں تھا۔ لڑکی کسی اُونچے اور فیشن پرست گھرانے کی تھی۔ اس کے پاس پرس نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی کو لُوٹا گیا ہے اور زیورات اور نقدی اڑا لی گئی ہے مگر ایسی جوان اور اتنی اچھی شکل و صورت کی لڑکی کی بے آبروئی نہیں کی گئی تھی۔ لاش کی شناخت ہو گئی۔ یہ حلیم ٹھیکیدار کی بیٹی تھی جس کا گھرانہ امیر اور فیشن پرست تھا۔ جنگِ عظیم نے فوج کے ٹھیکیداروں کو جنہیں کنٹریکٹر اور سپلائر کہا جاتا تھا، بے اندازہ دولت دی تھی۔ گھروں میں پردہ نہیں رہا تھا اور مسلمان ٹھیکیداروں نے بھی شراب نوشی شروع کر دی تھی۔ دولت نے اور دولت کے لالچ نے انہیں اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر دیا تھا۔ مقتولہ غالباً اسی آزادی کا شکار ہوتی تھی۔

جہاں سے لاش ملی وہاں تک ایک گاڑی گئی تھی۔ ٹائروں کے نشان

بتاتے تھے کہ کار کے ٹائر ہیں۔ ٹرک کے ٹائر ذرا چوڑے ہوتے ہیں۔ پولیس نے ٹائروں کے نشان محفوظ کر لئے۔ وہاں زمین کچی تھی۔ پاؤں کے نشان بھی ملے جن سے ظاہر ہوا کہ ملزم ایک نہیں زیادہ تھے۔ یہ نشان بھی محفوظ کر لئے گئے۔ حلیم یعنی لڑکی کے باپ نے بتایا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی کہ کوئی اس کی بیٹی کو قتل کر دے۔ یہ رہزنی ہو سکتی تھی لیکن لڑکی کو بھنگ کی جھاڑیوں تک کار میں لے جایا گیا تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں تک لڑکی زندہ گئی یا مُردہ۔ تھانیدار اسے رہزنی کی واردات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ لڑکی وہاں تک رات کے وقت نہیں جا سکتی تھی۔ وہ شہر کے مضافات کا ویران علاقہ تھا۔

یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ گئی اور اسے وہاں قتل کر دیا گیا۔ پھر یہ دوست کہاں گیا؟ موقعۂ واردات پر لڑنے جھگڑنے کے کوئی نشان نہیں تھے۔ پاؤں کے نشان بتاتے تھے کہ دو تین آدمی گاڑی سے اُترے، جھاڑی تک گئے اور گاڑی میں واپس آ گئے۔

ایک ہفتے تک تھانیدار کسی نتیجے پر نہ پہنچا تو مقتولہ کے باپ حلیم نے اپنے اثر و رسُوخ سے تفتیش سپیشل پولیس کے سپُرد کرا دی اور اس سلسلے میں میرا دوست انسپکٹر کنور دلیپ اپنے سٹاف کے ساتھ آ گیا اور اس نے تفتیش شروع کر دی۔ اس کی بتائی ہوئی تفصیلی باتوں کے مطابق یہ عجیب و غریب حادثہ اس طرح بنا۔ حلیم سے پوچھا گیا کہ لڑکی چونکہ آزاد خیال تھی، پردہ بھی نہیں کرتی تھی اس لئے اس کا میل جول ایک یا ایک سے زیادہ آدمیوں کے ساتھ ہو گا۔ گھر میں بھی حلیم افسروں کو مدعو کرتا رہتا تھا۔ ان میں سے کسی کی نظر لڑکی پر ہو گی۔ حلیم نے بتایا کہ صرف ایک نوجوان ہے جس کے ساتھ لڑکی کی وابستگی تھی۔ اس کے ساتھ وہ باہر بھی جاتی تھی لیکن حلیم نے یقین کے ساتھ کہا کہ اس لڑکے پر وہ ایسا شک نہیں کر سکتا کہ وہ لڑکی کو قتل کر دے گا۔ ان دونوں کی آپس میں اتنی محبت تھی کہ حلیم بیٹی کی شادی اسی لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ اس سے کنور دلیپ کو یہ شک ہوا کہ لڑکی اس لڑکے کے ساتھ باہر گئی اور رہزنوں نے یا کسی رقیب نے لڑکی کو قتل کر دیا لیکن ایسے قتل میں (کنور دلیپ کے تجربے کے مطابق) رسّی استعمال نہیں

کی جاتی۔ چاقو وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قتل لڑکے کو ہونا چاہیئے تھا۔ حملہ آوروں کا مقابلہ قدرتی طور پر لڑکے کو کرنا تھا۔ وہاں کی زمین بتاتی تھی کہ مقابلہ ہوا ہی نہیں۔

معلوم ہوا کہ لڑکے کے باپ کی کار ہے۔ باپ کا نام رحیم سمجھ لیں۔ رحیم اور حلیم کی گہری دوستی تھی۔ اس واردات کی تفتیش میں حلیم کے ساتھ اکثر رحیم ہوتا تھا۔ رحیم نے بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی مقتولہ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ دونوں گھرانوں کے گہرے تعلقات تھے۔ رحیم کے بیٹے کو بلایا گیا اور اس کی کار بھی منگوائی گئی۔ کنور دلیپ نے کار کی پہلی چیز یہ نوٹ کی کہ اس کے ٹائر سو فیصد موقعۂ واردات کے ٹائروں کے نشانات سے ملتے تھے، اگر یہ کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ایسے ٹائر بے شمار کاروں کے ہو سکتے تھے تاہم تفتیش کرنے والوں نے اس کار کو ذہن سے اتارا نہیں۔ لڑکے کی جذباتی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ باتیں کرتے اسے ہچکی آتی تھی اور وہ بچوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ واردات کی شام وہ کہاں تھا اور کیا لڑکی اس کے ساتھ گئی تھی؟ —— لڑکا اس رات انبالہ میں ہی نہیں تھا۔ اسے باپ نے دو روز پہلے باہر کہیں کام سے بھیج دیا تھا۔ وہ قتل سے ایک روز بعد واپس آیا تھا۔ اس کے باپ نے بھی بتایا کہ اس نے بیٹے کو کام سے بھیج رکھا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ کہاں اور کس کے پاس گیا اور کیا کام تھا۔ بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ لڑکا شہر میں نہیں تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ مقتولہ کا کوئی اور امیدوار تھا؟ کسی اور نے رشتہ مانگا تھا؟ یا کوئی اور اس کے ساتھ دوستی کا خواہشمند تھا؟ —— رحیم کا بیٹا ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ لڑکی نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا کہ کوئی اور اس کے پیچھے پڑا ہُوا ہے۔ لڑکی کے باپ نے بتایا کہ اس کے دو دوستوں نے رشتہ مانگا تھا۔ اُنہیں یہ جواب دیا گیا تھا کہ وہ لڑکی کی شادی رحیم کے بیٹے کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ یہ دونوں آدمی اس قماش کے نہیں تھے کہ اس جواب کو اپنی بے عزتی سمجھتے۔ اُنہوں نے لڑکی کے باپ

کی مجبوری سمجھ لی تھی۔

رحیم نے بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی مقتولہ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دراصل حلیم کے ساتھ گہری دوستی کا اظہار کر رہا تھا اس لئے کنور دلیپ نے (اور اس سے پہلے تھانیدار نے بھی) اس کی طرف توجہ نہ دی کیونکہ رحیم جذباتی انداز سے یہ بات کہتا تھا مگر رحیم کے بیٹے نے اپنا بیان دینے کے دوران جذبات میں آ کر کہا —— "مجھے اپنے باپ کے خلاف ایک گلہ ساری عمر رہے گا۔ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی کا باپ صرف رضامند ہی نہیں تھا بلکہ وہ میرے باپ پر زور دے رہا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کا رشتہ قبول کرلے لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی کہ میرا باپ نہیں مانتا تھا۔ لڑکی کی ماں سوتیلی ہے۔ وہ بھی زور دیتی رہی۔ میری اپنی ماں بھی کہتی رہی لیکن میرا باپ نہیں مانا۔"

اس بیان سے دو انکشاف ہوتے۔ ایک یہ کہ رحیم شادی کی مخالفت کرتا رہا مگر پولیس کو بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی مقتولہ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا انکشاف یہ کہ لڑکی کی ماں سوتیلی تھی۔ بعض سوتیلی مائیں ظلم کی حدیں عبور کر جایا کرتی ہیں۔ قتل میں اس عورت کا بھی ہاتھ ہو سکتا تھا لیکن کنور دلیپ نے لڑکے کے باپ کے اس دوہرے بیان پر توجہ جمع کر دی کہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات معمولی تھی لیکن لڑکے سے جو سوال و جواب ہوتے ان سے اس معمولی بات کو کچھ اہمیت حاصل ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ لڑکے نے باپ سے پوچھا کہ لڑکی میں یا لڑکی کے خاندان میں کیا خرابی ہے جس کی وجہ سے وہ یہ رشتہ قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ رحیم اور حلیم میں گہری دوستی تھی۔ باپ کوئی خرابی نہ بتا سکا۔ لڑکے نے کہا کہ باپ یہی بتا دے کہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں تو پھر لڑکا اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ رحیم کی بیوی نے بھی رحیم سے یہی سوال پوچھے اور کہا کہ ہمارا اپنا خاندان حلیم کے خاندان کی طرح امیر اور آزاد خیال ہے مگر باپ نے غصے میں جواب دیا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی اور اگر اسے کسی نے اور زیادہ مجبور کر کے 'ہاں' کرالی تو وہ شادی سے

پہلے خودکشی کر لے گا۔

لڑکی کی سوتیلی ماں سے کنور دلیپ نے ملاقات کی۔ یہ عورت ایسی معلوم نہیں ہوتی تھی کہ اتنا بڑا جرم کرتی یا کسی کو پیسے دے کر قتل کراتی۔ لڑکی چار پانچ سال کی تھی جب اس کی ماں مرگئی تھی۔ حلیم نے تھوڑے سے ہی عرصے بعد اس عورت کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ گھر میں روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ نوکر چاکر تھے اس لئے دوسری بیوی نے بچی کو اپنی بچی سمجھا۔ حلیم دوسری بیوی کو بہت چاہتا تھا۔ بچی بڑی پیاری تھی۔ وہ سوتیلی ماں کو بھی پیاری لگی۔ مختصر یہ کہ یہ عورت سوتیلی ماؤں سے بہت مختلف تھی۔ اس پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ لڑکی کی شادی رحیم کے بیٹے کے ساتھ ہو کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو اتنا زیادہ چاہتے تھے کہ جدا ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ لڑکا اکثر آتا تھا۔ لڑکی اس کے ساتھ باہر بھی جاتی تھی——سوتیلی ماں نے بتایا کہ قتل کی رات وہ باہر جانے کے لئے تیار نہیں ہوئی تھی۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا۔ وہ اس لڑکے کے سوا کسی اور کے ساتھ باہر نہیں جاتی تھی۔ اس نے معمولی سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، گلے میں سونے کی زنجیر اور لاکٹ تھا اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں انگوٹھی۔ یہ زیورات لاش کے ساتھ نہیں تھے۔ اس کا پرس گھر میں تھا۔

سوتیلی ماں نے بتایا کہ رات کھانے کے بعد تک وہ گھر میں رہی۔ روزمرہ عادت کے مطابق کھانے کے بعد کوٹھی کے سامنے ٹہلنے کے لئے نکلی۔ اس کے بعد کہیں نظر نہیں آئی۔ حلیم آدھی رات کے بعد گھر آیا۔ وہ شراب پیئے ہوئے تھا۔ اسے بتایا گیا کہ لڑکی گھر سے غائب ہے۔ حلیم نے نشے کی حالت میں کہا کہ سینما کا آخری شو دیکھنے کے لئے چلی گئی ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ سو گیا۔ اگر وہ نشے میں نہ ہوتا تو کوئی کارروائی کرتا۔ صبح بیوی نے اسے جلدی جگا کر بتایا کہ لڑکی واپس نہیں آئی۔ تب وہ گھبرایا اور کہنے لگا کہ رحیم کے گھر جا کر معلوم کرتا ہوں۔ وہ بہت دیر بعد روتا ہوا واپس آیا اور بتایا کہ لڑکی قتل ہوگئی ہے اور لاش ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لئے گئی ہے——سوتیلی ماں شک سے پاک نکلی۔

رحیم سے کنور دلیپ نے پوچھا کہ وہ مقتولہ کا رشتہ کیوں پسند نہیں کرتا تھا؟ کنور دلیپ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ لڑکی کا چال چلن اچھا نہیں تھا جس کا رحیم کو علم تھا۔ اگر ایسی بات تھی تو یہی ہوا ہوگا کہ لڑکی کسی اور کے ساتھ گئی اور ماری گئی۔ رحیم کوئی ٹھوس اور تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ سوائے اس کے کہ یہ لڑکی اسے پسند نہیں تھی۔ لڑکی کی سوتیلی ماں نے یہ بھی کہا تھا کہ رحیم لڑکی کے ساتھ بہت پیار کرتا اور اسے بیٹی کہتا تھا۔ رحیم نے کنور دلیپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ لڑکی نیک چلن تھی۔ پولیس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ کہاں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اس کی تضاد بیانی مشکوک تھی۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی مقتولہ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، حالانکہ وہ اس کے خلاف تھا۔ اس نے ذرا سوچ کر جواب دیا کہ اس نے ایک دو دن ہوئے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یہ رشتہ قبول کر لے گا۔

کنور دلیپ پریشان ہونے لگا تھا۔ تفتیش آگے بڑھ ہی نہیں رہی تھی۔ سات آٹھ دن گذر گئے تھے۔ اس طرح قتل کو پندرہ سولہ دن ہو گئے تھے۔ ایک روز ایک آدمی دوڑتا ہوا پولیس سٹیشن میں داخل ہوا۔ وہ ایک ہندو صراف کا نوکر تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک معمولی سا آدمی زیورات کی کچھ چیزیں بیچنے اس کے مالک کی دوکان میں آیا ہے۔ اس نے گلے کی ایک زنجیر بھی دی ہے جس کے ساتھ لاکٹ ہے۔ لاکٹ میں تصویر ہے۔ نوکر نے تصویر نہیں دیکھی تھی۔ مالک نے زیورات بیچنے والے سے ہٹ کر نوکر کو پولیس سٹیشن کی طرف اس زبانی پیغام کے ساتھ دوڑا دیا کہ پولیس جلدی دکان میں آ جائے، لاکٹ مشکوک ہے۔ کنور دلیپ ایک دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لئے پہنچ گیا۔

زیورات بیچنے والا بالکل معمولی سا آدمی تھا۔ اس نے صراف کو سونے کی زنجیر اور لاکٹ کے علاوہ بالیوں کی جوڑی اور ایک انگوٹھی بھی دی۔ صراف نے لاکٹ کھولا تو اس میں چھوٹی سی فوٹو تھی۔ یہ فوٹو رحیم کے بیٹے کی تھی۔ صراف

نہیں جانتا تھا کہ یہ کس کی فوٹو ہے۔ یہ بہر حال اس کی نہیں تھی جو لاکٹ بیچنے آیا تھا۔ اس کے علاوہ پولیس نے شہر کے تمام صرافوں اور سناروں کو در پردہ کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی آدمی زنجیر بمع لاکٹ، انگوٹھی اور بالیاں یا ان میں سے کوئی چیز بیچنے آئے تو پولیس کو اطلاع دیں۔ صراف عموماً زیورات خرید کر فوراً توڑ یا پگھلا دیتے ہیں تاکہ شناخت ہی ختم ہو جائے۔ یہ اونچے درجے کا صرّاف تھا۔ پولیس کا ڈر بھی تھا۔ اُس نے اس آدمی کو بٹھایا اور یہ کہہ کر پچھلے کمرے میں چلا گیا کہ ذرا دیکھ لے کہ سونے میں ملاوٹ کتنی ہے۔ اندر جا کر اُس نے اپنے ایک نوکر کو پولیس سٹیشن بھیج دیا اور خود اندر رہا۔ پھر باہر آ کر بیچنے والے کو باتوں میں لگا لیا۔ اُسے یہ کہہ کر خوش کر دیا کہ سونا بالکل خالص ہے اور اس کے اسے بہت پیسے ملیں گے۔ وہ وقت گزارتا رہا اور اس آدمی کو باتوں میں بھی لگاتے رکھا۔ اس آدمی کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ اُسے اتنا بھی علم نہیں تھا کہ لاکٹ کھُل بھی جاتا ہے، ورنہ وہ کھول کر دیکھ لیتا اور تصویر ضائع کر دیتا۔

کنور دلیپ کے آگے صرّاف نے یہ چیزیں رکھ دیں۔ اس آدمی سے پوچھا کہ وہ کہاں سے لایا ہے۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا اور کانپنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ وہ رحیم کا نوکر ہے۔ اسے پولیس سٹیشن لے گئے جہاں وہ کنور دلیپ کے پاؤں میں گر پڑا اور اُس نے بتا دیا کہ وہ کراتے کا قاتل ہے اور یہ زیورات اُس نے مقتولہ کی لاش سے آتارے تھے۔ کنور دلیپ نے اُس پر یہ رحم کیا کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا۔ اُس نے بتایا کہ اس نے مقتولہ کو رحیم کے ایک نوکر کے ساتھ قتل کیا ہے۔ کار رحیم کی تھی اور اس کے ڈرائیور نے چلائی تھی۔ یہ قتل رحیم نے کروایا ہے اس کی اُجرت تینوں کو ایک ایک ہزار روپیہ دی گئی ہے۔ ان وقتوں میں ایک ہزار روپیہ بہت بڑی رقم ہُوا کرتی تھی۔ اُس نے بتایا کہ رحیم نے انہیں سختی سے کہا تھا کہ وہ لڑکی کو صرف قتل کریں گے اس کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ اُس نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے قتل کرنے سے پہلے لڑکی کو خراب کیا ہے تو وہ اُنہیں اپنی دولت اور اثر و رسوخ

سے گرفتار کرا کے سزائے موت دلا دے گا۔ اس دھمکی سے وہ ڈر گئے تھے۔ اُنہوں نے لڑکی کو قتل کیا۔ قتل کے بعد اُنہوں نے دیکھا کہ لاش کے ساتھ زیورات بھی ہیں۔ انہوں نے زیورات اُتار لئے۔ انہیں اپنے پاس چھپائے رکھنا خطرناک تھا۔ اس آدمی کے ساتھی زیورات جلدی بیچ کر پیسے تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ ان میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ آخر اس آدمی سے کہا گیا کہ وہ یہ چیزیں بیچ آئے مگر وہ پکڑا گیا۔

اس کی نشاندہی پر دوسرے نوکر اور ڈرائیور کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ساتھ رحیم کو بھی زیرِ حراست لے لیا گیا۔ رحیم نے جرم کے ساتھ کسی قسم کے تعلق سے انکار کر دیا۔ اس کے ڈرائیور اور دوسرے نوکر نے بھی ابتدا انکار سے کی لیکن پولیس کے تشدد اور وعدہ معاف گواہ کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ رحیم کی کار قبضے میں لے لی گئی۔ آخر رحیم نے بھی اقبالِ جرم کر لیا۔ اس نے قتل کی جو وجہ بتائی اس سے یہ جرم عام قسم کے قتل کی بجائے ایک حیرت انگیز جرم بن جاتا ہے۔

یہ کہانی پہلی جنگِ عظیم سے شروع ہوتی ہے جب رحیم جوان تھا۔ اُس کا باپ امیر کبیر تاجر تھا۔ رحیم کو اپنے خاندان جیسے ایک گھرانے کی لڑکی اچھی لگنے لگی۔ پردہ نہیں تھا۔ ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور اُنہوں نے جذبات سے مجبور ہو کر شادی کا فیصلہ کر لیا۔ رحیم نے اپنی ماں کو منوا لیا لیکن باپ نہ مانا۔ لڑکی بھی رحیم کی طرح دلیر تھی۔ اُس نے اپنے جیسی لڑکیوں کی طرح یہ نہ کہا کہ وہ رحیم کے ساتھ بھاگ چلنے کو تیار ہے۔ اُس نے ایک انوکھا فیصلہ کیا جو یہ تھا کہ وہ چوری چھپے شادی کر لیں گے۔ اپنے اپنے گھر رہیں گے اور وقت آنے پر سب کو بتا دیں گے کہ وہ شادی کر چکے ہیں۔ رحیم کو یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔ ہر انسان کی اپنی اپنی نفسیات ہوتی ہے، اس لئے خیال بھی الگ الگ اور فیصلے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے جذبات میں آ کر عقل کو خیر باد کہہ دیا اور خفیہ شادی کے لئے تیار ہو گئے۔

پیسے میں طاقت ہے۔ رحیم نے ایک مولوی کو منہ مانگے پیسے دیتے۔

ایک دوست نے نکاح میں گواہی اور اپنا ایک کمرہ پیش کیا۔ ایک اور دوست مل گیا۔ ایک روز لڑکی آئی۔ مقررہ جگہ پر رحیم منتظر تھا۔ وہ لڑکی کو اپنے دوست کے کمرے میں لے گیا جہاں دو دوست اور ایک مولوی موجود تھا۔ نکاح پڑھا گیا اور نکاح نامے پر دستخط ہو گئے۔ باقی سب چلے گئے۔ رحیم اور لڑکی وہیں رہے۔ وہ اب میاں بیوی بن چکے تھے۔ شام سے پہلے لڑکی اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد انہیں جب بھی موقعہ ملا وہ اسی کمرے میں ملے۔ پندرہ سولہ دنوں بعد انقلاب آ گیا۔ لڑکی کی شادی طے ہو گئی اور چند دنوں بعد لڑکی کو ڈولی میں ڈال کر حلیم کے حوالے کر دیا گیا۔ حلیم کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی دلہن رحیم کو صرف چاہتی ہی نہیں بلکہ اُس کی دلہن بھی بن چکی ہے۔ اس مرحلے میں آ کر رحیم کی مردانگی جواب دے گئی۔ وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ گھر والوں کے لئے مسئلہ بن گیا۔ اُس نے گھر والوں کو یہ نہ بتایا کہ حلیم کی بیوی اُس کی بیوی بن چکی ہے۔ وہ لڑکی کی بدنامی کے خیال سے چپ رہا۔ ان کا اقدام ہی ایسا تھا جو وہ در پردہ کر بیٹھے تھے مگر یہ نہ سوچ سکے کہ وقت آنے پر وہ مخالفانہ طوفان کا مقابلہ کس طرح کریں گے۔

رحیم کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی۔ اسے اچھے اچھے رشتے پیش کئے گئے جو اُس نے قبول نہ کئے۔ وہ دیوانوں کی طرح حرکتیں کرنے لگا تو ماں باپ نے اس سے کہا کہ وہ جو مانگتا ہے اسے دیا جائے گا وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس وقت کاروباری لوگوں کی زبان پر برما اور رنگون کا نام زیادہ آتا تھا۔ وہاں کا کاروبار ہندوستان خصوصاً پنجاب سے گئے ہوئے لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ رحیم بھی برما اور رنگون سُنتا رہتا تھا۔ اُس نے باپ سے کہا کہ اُسے بہت سی رقم دے کر رنگون جانے دیا جائے۔ برما بھی ہندوستان کی طرح انگریزوں کی حکومت میں تھا۔ رحیم رقم لے کر رنگون چلا گیا۔ شہر اور ملک سے باہر کی آب و ہوا نے اس پر اچھا اثر کیا۔ وہ کاروباری باپ کا بیٹا تھا۔ رنگون میں جو برما کا دارالحکومت تھا، رحیم نے دکان کھول لی یا شاید ہوٹل کھول لیا۔ بہر حال اس کا کاروبار چل نکلا۔ اس کے لئے یہ ایک نئی دنیا

تھی۔ وہاں پنجابیوں کی کمی نہیں تھی۔ ہندوستان کے لوگ بھی تھے۔ ایک سال بعد وہ دکان یا ہوٹل میں نوکر رکھنے کے قابل ہو گیا۔ وہ انبالہ آیا۔ اپنی خفیہ دلہن کو دیکھنے کے لئے اُس نے حلیم کے ساتھ دوستی کر لی اور اس کے گھر گیا۔ چند دِنوں میں دوستی گہری کر کے حلیم کی بیوی سے ملا جسے اس نے ایک بند کمرے میں اپنی بیوی بنایا تھا۔

اس وقت لڑکی کی پہلی بچی پیدا ہو چکی تھی۔ لڑکی بہت روئی اور اسے بتایا کہ اس کے ساتھ کیسی ظالمانہ زبردستی ہوتی ہے۔ لڑکی کی جسمانی اور ذہنی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس نے اپنے دل کو غم لگا لیا تھا۔ اُس نے رحیم کو بتایا کہ یہ پہلی بچّی حلیم کی نہیں بلکہ اس کی (رحیم کی) ہے۔ ان کی خفیہ شادی کے فوراً بعد لڑکی کی شادی حلیم کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ اس لئے کسی نے شک تک نہ کیا کہ بچی حلیم کی نہیں۔ لڑکی نے رحیم سے کہا کہ وہ اپنی جوانی تباہ نہ کرے اور شادی کر لے۔ رحیم کی خواہش تھی کہ وہ بچی کو اپنے ساتھ برما لے جاتے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ کچھ دن اور رہ کر رنگون چلا گیا۔

رنگون میں اس نے ایک پنجابی گھرانے میں شادی کر لی۔ اس سے اس کا لڑکا پیدا ہوا۔ چار سال بعد وہ انبالہ آیا تو اُسے پتہ چلا کہ اُس کی خفیہ بیوی مر گئی ہے۔ وہ حلیم سے مِلا۔ وہ دوست بن چکے تھے۔ اُس نے حلیم سے کہا کہ وہ اب دوسری شادی کر لے گا جس سے بچی کی زندگی سوتیلی ماں کے ہاتھوں جہنم بن جائے گی، اس لئے وہ بچّی اسے دے دے۔ حلیم اس پیش کش کو دوستی کے جذبات کا اظہار سمجھا۔ اُس نے ہنس کر ٹال دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رحیم اپنی بچی مانگ رہا ہے۔ وہ ابھی انبالہ میں ہی تھا کہ حلیم نے دوسری شادی کر لی۔ رحیم رنگون چلا گیا۔ اس کے بعد وہ چار چار پانچ پانچ سال بعد انبالہ آتا اور اپنے بیوی بچوں کو حلیم کے گھر لے جاتا تھا۔ وہ اپنی بچی کیلئے کھلونے اور تحفے لے جاتا تھا۔ اس کا پہلا لڑکا اور بچی ایک دوسرے میں گھل مِل گئے۔ بچے جوان ہو گئے اور دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں جاپان کی افواج نے اتنی تیزی سے حملہ کیا کہ ملایا، سنگاپور اور

ان تمام علاقوں پر قابض ہو کر برما کی طرف بڑھنے لگیں۔ برما میں جاپانیوں کی دہشت اتنی پیدا ہو چکی تھی کہ جو لوگ برما کے رہنے والے نہیں تھے، وہ وہاں سے بھاگنے لگے۔ رحیم نے عقل مندی کی کہ ہوٹل یا دوکان، جو کچھ بھی تھا، برمیوں کے ہاتھ بیچ کر نکل آیا ۔ پیچھے جو رہ گئے تھے ان کی حالت بہت بُری ہوتی تھی۔ رحیم انبالہ آیا۔ اُس کے پاس بہت دولت تھی۔ اس کا باپ بوڑھا ہو چکا تھا۔ رحیم نے باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ پھر اس کا باپ مر گیا۔ اس وقت رحیم کا پہلا بیٹا جوانی میں داخل ہو رہا تھا۔ رحیم نے حلیم کے ساتھ دوستی اور زیادہ گہری کر لی۔ اس سے دونوں خاندانوں کے تعلقات گہرے ہو گئے مگر کوئی بھی نہ جان سکا کہ رحیم کی تمام دلچسپیاں اپنی پہلی بچی کے ساتھ ہیں جو اس کی محبت کی یادگار تھی۔ اس بچی کی سوتیلی ماں نے پولیس کو بتایا تھا کہ رحیم اس لڑکی کے ساتھ بہت پیار کرتا تھا اور اسے بیٹی کہتا تھا۔

جس طرح رحیم کے دل کا راز کوئی نہ جان سکا، اسی طرح رحیم قدرت کا یہ بھید نہ پا سکا کہ جہاں دو جوان دل اکٹھے ہوتے ہیں وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو اس کے ساتھ جوانی میں ہو چکا ہے۔ اس بھید کو جانتے ہوئے بھی اُس نے ادھر توجہ نہ دی۔ اس کی توجہ اس وقت ادھر آئی جب ایک روز حلیم کی بیوی نے اسے کہا ”بھائی جان! آپ ہم سے راشد کے لئے صبیحہ کا رشتہ کیوں نہیں مانگتے؟ حلیم صاحب تو فیصلہ کئے بیٹھے ہیں کہ صبیحہ آپ کی بہو بنے گی۔“

رحیم کو چکر آ گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ آ چلے تھے کہ سگی بیٹی بہو نہیں بن سکتی۔ اُس نے ہونٹ دانتوں تلے دے لئے۔ ذرا سنبھل کر اس نے کہا ”میں اس لئے ایسی بات نہیں کہتا کہ حلیم یہ نہ کہے کہ میں دوستی میں خود غرض ہوں۔ آپ لوگوں کے ساتھ میری محبت جذباتی ہے۔ آپ سے کچھ مانگوں گا نہیں۔ صبیحہ کو میں بیٹی کہتا ہوں، اسے بہو نہیں بناؤں گا۔“

سوتیلی ماں ہنس پڑی۔ اُس نے کہا ”آپ تصوّراتی اور جذباتی باتیں کرتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ راشد اور صبیحہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ

کر جیتے ہیں۔ صبیحہ مجھے کہہ بھی چکی ہے کہ میں راشد کے لئے اس کی بات پکی کرا دوں۔“

رحیم نے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس نے انبالہ سے کہیں اور چلے جانے کی بھی سوچی مگر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کچھ عرصہ اور گذرا تو اُس کی اپنی بیوی نے اسے کہا کہ وہ حلیم سے صبیحہ کا رشتہ مانگے۔

اُس نے انکار کر دیا۔ پھر حلیم کو خود رحیم سے کہنا پڑا کہ وہ صبیحہ راشد کے لئے لے لے۔ حلیم یہ سُن کر بہت حیران ہوا کہ رحیم انکار کر رہا ہے۔ آخر اُس کے اپنے بیٹے نے اُسے کہا کہ وہ صبیحہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ رحیم اُسے اصل وجہ نہیں بتا سکتا تھا۔ اُسے وجہ بتا دینی چاہئے تھی۔ اگر بتا دیتا تو اتنا بڑا حادثہ نہ ہوتا۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُس نے بیٹے سے کہا کہ وہ صبیحہ کے ساتھ شادی نہ کرے۔ بیٹے نے پوچھا کہ اگر لڑکی بدچلن ہے تو اسے ثبوت دیا جائے پھر وہ اس کا نام بھی نہیں لے گا۔ رحیم اپنی سگی بیٹی کے خلاف ایسی بات منہ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اُس نے صرف یہ نقص بتایا کہ صبیحہ راشد سے تین چار سال بڑی ہے۔ اس کی یہ دلیل کسی نے بھی قبول نہ کی۔ وہ بڑے ہی تکلیف دہ چکر میں آ گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ چکر تیز ہی تیز ہوتا گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ اسے ہر طرف سے یہی آواز سنائی دینے لگی ”راشد اور صبیحہ کی شادی جلدی کر دو۔“

اُس کی اپنی بیوی، بیٹا، حلیم، اس کی بیوی اور صبیحہ شادی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ رحیم کے پاس یہی ایک دلیل رہ گئی کہ اس نے سخت غصّے کی حالت میں یہ کہنا شروع کر دیا ”یہ شادی نہیں ہو گی۔ میں نہیں ہونے دوں گا۔“

تاریخ اپنے آپ کو دُہرانے پر آ گئی۔ ایک روز راشد نے اسے کہا ”ابا جان! میرے سامنے اب دو راستے رہ گئے۔ میں کوئی سا اختیار کر لوں گا۔ ایک یہ کہ صبیحہ کے ساتھ کہیں چلا جاؤں گا۔ دوسرا یہ کہ کورٹ میں جا کر صبیحہ سے شادی کر لوں گا۔“

بیٹے کی حالت دیکھ کر اسے جوانی یاد آگئی۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ اس ذہنی اور جذباتی حالت میں اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لے کر خفیہ شادی کر لی تھی۔ اب اس کا بیٹا بھی اسی جذباتی حالت کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ بھی خطرہ مول لے سکتا ہے۔ اس خطرے کو اور اس شادی کو رحیم ٹال نہیں سکتا تھا اور وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اُس کی اپنی بیٹی اور اپنا بیٹا میاں بیوی بن کر رہیں۔ لڑکی کو وہ اپنی جائز اولاد سمجھتا تھا۔ اس نے کلمے پڑھ کر گواہوں کی موجودگی میں شادی کی تھی ۔۔۔۔ آخر اُس کا دماغ بیکار ہو گیا۔ اس نے انتہائی بھیانک فیصلہ کیا۔ اُس کے کئی ایک نوکر تھے۔ کاروبار اور ٹھیکیداری خاصی وسیع تھی۔ ان نوکروں میں اس کا ڈرائیور اور دو نوکر خاص طور پر اس کے قابلِ اعتماد تھے۔ اُس نے جس طرح جوانی میں آگے پیچھے دیکھے بغیر خفیہ شادی کر لی تھی۔ اسی طرح اپنی بیٹی صبیحہ کو دُنیا سے ہی غائب کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے تحت اس نے ڈرائیور اور دو نوکروں کو ایک ایک ہزار روپیہ پیش کیا اور صبیحہ کے قتل کی سکیم بنا لی۔

دونوں نوکروں کو معلوم تھا کہ راشد اور صبیحہ کی میل ملاقات ہے اور ان پر کوئی پابندی نہیں۔ سکیم کے تحت رحیم نے راشد کو دو روز پہلے باہر کام سے بھیج دیا اور ایسی جلدی میں بھیجا کہ راشد صبیحہ کو نہ بتا سکا کہ وہ چار پانچ دِنوں کے لئے باہر جا رہا ہے۔ نوکروں اور ڈرائیور نے جو بیان دیئے ان سے معلوم ہُوا کہ قتل کی رات ڈرائیور کار لے کر صبیحہ کے گھر سے کچھ دُور جا رُکا۔ دونوں نوکر ساتھ تھے۔ ایک نوکر صبیحہ کی کوٹھی کے اِردگرد گھوما۔ اسے چوری چھُپے صبیحہ سے کہنا تھا کہ اسے راشد بلا رہا ہے۔ اللہ کو جو منظور ہوتا ہے وہ ہو کے رہتا ہے۔ سبب بن جاتے ہیں۔ صبیحہ کھانا کھا کر ذرا ٹہلنے باہر آگئی۔ نوکر نے اسے جھوٹا پیغام دیا۔ صبیحہ نے گھر والوں کو بتانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ نوکر کے ساتھ چل پڑی۔ نوکر نے کہا کہ تانگہ لے لیں گے۔ اتنے میں رحیم کی کار چوک پر سے کھڑی تھی آگئی۔ ڈرائیور نے یہ اداکاری کی کہ وہ کہیں سے آ رہا تھا، صبیحہ کو دیکھ کر رک گیا ہے۔ صبیحہ کار میں بیٹھ گئی۔ ایک نوکر صبیحہ

کے ساتھ دوسرا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اور کار ہوا ہو گئی۔

کار چھاؤنی سے نکل کر ویرانے میں گئی تو صبیحہ نے پوچھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ پھر اس نے چیخ و پکار کی۔ تب اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے نوکر نے گز بھر رسّی نکالی جو اس نے صبیحہ کی گردن کے گرد لپیٹ کر مروڑ دی۔ نازک سی لڑکی تڑپی اور مر گئی۔ آگے بھنگ کی جھاڑیاں تھیں۔ وہاں کار رُکی۔ تینوں نے لاش اٹھائی اور جھاڑیوں میں چھپا کر واپس آگئے۔ اگلے روز رحیم کو اطلاع ملی کہ حلیم کی بیٹی قتل ہو گئی ہے تو اُس نے جا کر لاش دیکھی اور تینوں کو ایک ایک ہزار روپیہ ادا کر دیا۔ نوکروں نے اپنے طور پر زیورات اتار لئے تھے جنہوں نے انہیں پکڑوا دیا۔

رحیم نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ خودکشی کر لینا چاہتا تھا مگر ہمت نہ ہوتی۔ اس کے لئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ خودکشی کا ارادہ اس کے دل سے نکلا نہیں تھا۔۔۔ کنور دلیپ کو یہ سارا بیان دے کر اس نے مجسٹریٹ کے سامنے اقبالِ جُرم قلم بند کرانے سے انکار کر دیا۔ پولیس کے پاس وعدہ معاف گواہ تھا۔ رحیم کے اقبالی بیان کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ ہو سکتا ہے رحیم نے رشوت دی ہو یا شاید پولیس ثابت نہ کر سکی۔ ہُوا یُوں کہ رحیم کو سیشن کورٹ نے بری کر دیا۔ وعدہ معاف گواہ کو تو معافی ملنی ہی تھی۔ دوسرے نوکر کو جس نے لڑکی کے گلے میں رسّی ڈالی تھی عمر قید دی گئی اور ڈرائیور کو سات سال قید۔

مگر ابھی ڈرامہ مکمل نہیں ہُوا تھا۔ عدالت میں تینوں ملزموں نے رحیم کے خلاف بیان دیئے تھے۔ کنور دلیپ نے رحیم کا بیان سنایا۔ رحیم پر سرکاری وکیل نے جرح بھی بہت کی لیکن رحیم نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ صبیحہ اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ قانون چونکہ پولیس سے مطمئن نہ ہُوا اس لئے اسے بری کر دیا گیا مگر عدالت میں جو لوگ موجود تھے وہ مان گئے کہ رحیم کی کہانی صحیح ہے۔ نوکروں کو کیا پڑی تھی کہ لڑکی کو قتل کرتے۔ رحیم بری ہو کر گھر آیا تو اس سے تھوڑی دیر بعد اس کا بیٹا ایک خون آلود

چاقو اٹھاتے پولیس سٹیشن گیا۔ چاقو تھانیدار کی میز پہ رکھ کر کہا — "قانون نے میرے باپ کو بخش دیا ہے۔ میں نے اسے سزائے موت دے دی ہے۔ میں اسے قتل کر آیا ہوں۔ لاش گھر میں پڑی ہے۔"

راشد کو زیرِ حراست لے لیا گیا۔ اسے دس سال سزائے قید ہوئی تھی۔ چھ سات ماہ بعد پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ بعد میں قیدیوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ معلوم نہیں راشد پاکستان آیا تھا یا نہیں۔

❋

.....اور لڑکی مجھے غار سے نکال لائی

راوی: اورنگ زیب خان
تحریر: اشفاق رسول

جن لوگوں نے جنگل نہیں دیکھے وہ سمجھتے ہیں کہ جنگل میں درندے، پرندے اور جنگلی جانور ہوتے ہیں اور وہاں لوگ شکار کھیلنے کے لئے جاتے ہیں یا وہ یہ جانتے ہیں کہ وہاں آدم خور شیر ہوتے ہیں۔ جنگل میں صرف یہی نہیں ہوتا جو آپ پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں۔ جنگل میں عجیب و غریب بھید چھپے ہوتے ہیں۔ اِن رازوں سے صرف وہ لوگ واقف ہیں جو کسی جنگل میں کام کرتے ہیں۔ میں جب انڈیا سے پاکستان میں آیا تھا اُس وقت میری عمر چھیالیس سال تھی۔ ان چھیالیس سالوں میں، مَیں نے چھبیس سال نینی تال کے جنگلوں میں نوکری کی ہے۔ وہاں شیر، چیتے، ریچھ، بھیڑیئے لکڑ بگے بہت ہوتے تھے اور دوسرے جانوروں میں سامبر، چیتل اور ہرن بھی تھے۔ خرگوش اور سیہہ بھی پائے جاتے تھے۔ جنگل کے اس علاقے میں جہاں میری ڈیوٹی تھی، ایک ندی گزرتی تھی جو ایک پہاڑی کے قریب آکر جھیل بن جاتی تھی۔ پانی جمع ہو کر پھیلا ہوا تھا اس کے تین طرف دیواروں کی طرح پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس جھیل میں چھوٹے مگرمچھ ہوتے تھے۔ ہر ایک درندے اور جانور کے شکار کی اجازت تھی۔ صرف مگرمچھ ایسا جانور تھا جس کے شکار کی اجازت نہیں تھی۔

ان درندوں میں ایسے انسان بھی تھے جو درندوں سے کم نہیں تھے۔

یہ لوگ جنگل کے مجرم تھے۔ شکاری جو اس جنگل میں آتے تھے، لائسنس لے کر آتے تھے اور یُوں نہیں ہوتا تھا کہ وہ جتنے درندے یا جانور مارنا چاہیں مار لیں۔ ہر شکاری کو باقاعدہ پرمٹ ملتا تھا کہ وہ کون سے جانور کتنی تعداد میں مار سکتا ہے۔ مثلاً ایک شیر اور دو ہرن یا ایک چیتا وغیرہ۔ ایک سے زیادہ شیر مارنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ قانون کی پابندی کرانے کے لئے جنگل کا سرکاری محکمہ تھا اور جنگل کی چوکیداری کے لئے بہت نفری تھی۔ میں اسی نفری میں تھا۔ وہاں جنگل کے جو مجُرم تھے وہ طرح طرح کی چوریاں کرتے تھے جن میں ایک یہ تھی کہ درخت کاٹ کر لے جاتے تھے اور دوسرا جُرم جو کبھی کبھی دیکھنے میں آتا تھا یہ تھا کہ یہ لوگ شیروں، چیتوں اور ہرنوں کو پھندوں میں پھانستے تھے یا زہریلی غذائیں پھینک کر انہیں مارنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر ان کے مُردار اُٹھا لے جاتے اور ان کی کھالیں اُتار کر شہروں میں بیچتے تھے۔ انگریز اور راجے مہاراجے ان چیزوں کی مُنہ مانگی قیمت دیتے تھے۔ ان چوریوں کے علاوہ جنگل میں ڈاکو آکر چھُپا کرتے اور اغوا کی ہوئی عورتوں کو بھی چھپایا کرتے تھے۔ وہاں انہیں پکڑنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

میں آپ کو جو کہانی سنانے لگا ہوں یہ ایسے ہی جنگلی چوروں کی ایک واردات ہے۔ اُس وقت میں جوان تھا۔ جنگل کی نوکری کا شاید چھٹا سال تھا۔ میں جنگل سے اور اس کے خطروں سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ مجھے ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ جنگل کے چور شیروں وغیرہ کو زہر بھی دے دیتے ہیں۔ ایک روز ایک انگریز کپتان شکار کے لئے آیا۔ مجھے اس کے ساتھ بھیجا گیا۔ وہ درخت پر مچان بندھوا کر شیر مارنا چاہتا تھا۔ تمام انتظامات کر دیئے گئے۔ دن کے پچھلے پہر ہم اسے مچان تک چھوڑنے کے لئے گئے۔ اچانک میری نظر ایک درخت کے نیچے پڑی۔ مجھے تنے کی دوسری طرف ایک دھاری دار شیر (ٹائیگر) کا پچھلا حصہ نظر آیا۔ اس کی دُم آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ اچھا ہُوا کہ میں نے دیکھ لیا۔ فاصلہ مشکل سے بیس گز

ہوگا۔ میں نے کپتان کو روک لیا اور اشارے سے اُسے شیر دکھایا۔ اس نے رائفل دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی اور بیٹھ کر آگے سرکنے لگا لیکن شیر اُٹھ کھڑا ہُوا اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ وہ تنے کی اوٹ سے سامنے آگیا۔ تھوڑے سے قدم چل کر رُک گیا۔ اُس نے ہماری طرف دیکھا۔ کپتان نے رائفل کندھے سے لگا لی مگر جلد ہی اُس نے رائفل کندھے سے ہٹا لی اور شیر کو دیکھنے لگا۔ میں بھی حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شیر اتنی مہلت نہیں دیا کرتا۔ وہ حملہ کرتا ہے یا بجلی کی چمک کی طرح غائب ہو جاتا ہے لیکن وہ کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر چل پڑا لیکن اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ شیر پھر رُک گیا۔ کپتان اسے دیکھتا رہا۔ شیر نے زور سے ابکائی لی۔

اس کا سر نیچے کو ہو گیا۔ ٹانگیں دوہری ہو گئیں اور وہ ایک پہلو پر گر پڑا۔ کپتان نے دو چار منٹ انتظار کیا۔ جب دیکھا کہ شیر نے کوئی حرکت نہیں کی تو آگے چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ شیر مر چکا تھا۔ کپتان تجربہ کار تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ ایک آدمی کو یہاں کسی جھاڑی میں چھپا دیا جائے اور باقی سب واپس چلیں۔ میں نے گوپل نام کے ایک ملازم کو وہاں رہنے کو کہا۔ کپتان نے اُسے اُردو زبان میں سمجھایا کہ وہ جھاڑی میں چھُپ کر شیر کو دیکھتا رہے۔ اگر کوئی آدمی شیر کی کھال اُتارنے آئے تو اسے پکڑنے کی کوشش کرے اور اگر وہ زیادہ ہوں تو ان کا پیچھا کر کے دیکھے کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔ کپتان نے یہ بھی کہا کہ رات سے پہلے کھال اُتارنے کوئی نہیں آئے گا۔ شیر کو کھال چوروں نے زہریلا گوشت کھلایا ہے۔ وہ رات کے وقت اس کی کھال اُتارنے آئیں گے۔

ہم سب کپتان کے ساتھ واپس آگئے۔ اُس نے ہمارے افسر کو بتایا کہ جنگل میں کوئی کھال چور آگیا ہے۔ مجھے آٹھ دس آدمی دو جن کے پاس رائفلیں ہوں تو اچھا ہے، ورنہ برچھیوں سے مسلح ہوں۔ اسے آدمی دے دیئے گئے۔ وہ شیر کے اردگرد ان آدمیوں کو چھُپا کر کھال چوروں کو پکڑنا چاہتا تھا۔ ہمارا صاحب بھی ساتھ چل پڑا۔ وہ تمام آدمیوں کو بتاتا جا رہا تھا کہ انہیں کیا

کرنا ہے۔ جب ہم شیر کی جگہ پہنچے تو ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں شیر پڑا تھا مگر اس کی کھال اور سر غائب تھا۔ میں نے گومل کو آوازیں دیں۔ اُسے ہم جھاڑی میں چھپا آتے تھے۔ اُس کا

کوئی جواب نہ ملا۔ اُس جھاڑی کی طرف گئے جہاں وہ چھپا ہُوا تھا۔ وہ ہمیں مل گیا لیکن مرا ہُوا۔ اُس کی پیٹھ میں خنجر یا چاقو کے دو گہرے زخم تھے اور ایک وار دل پر تھا۔ اس کی لاش خون سے لال ہو گئی تھی۔ ہم جنگل کے جتنے ملازم تھے سب پر خوف طاری ہو گیا۔ یہ کسی جن یا بھوت پریت کی کارروائی معلوم ہوتی تھی۔ شیر کے مُردار کو فوراً زمین میں دبا دیا گیا تاکہ اس کا زہریلا گوشت کوئی دوسرا شیر نہ کھا لے۔

اگر شیر کی کھال نہ آتاری جاتی اور ہمارا آدمی نہ مارا جاتا تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ شیر کو کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے یا وہ کسی بیماری سے مر گیا ہے۔ یہ کھال چوروں کا کام تھا۔ صاحب نے حکم دیا کہ تمام جنگل میں گشت کا انتظام کیا جاتے اور دو دو آدمی رائفلیں لے کر ہر وقت گشت پر رہیں۔ علاقے تقسیم کر کے پہرے مقرر کر دیئے گئے۔ پرانے ملازم بتاتے تھے کہ ان کی یاد میں ایسا واقعہ کبھی نہیں ہُوا تھا۔ بہت عرصہ پہلے پھندوں میں جانور پھنسانے اور کھالیں اُتارنے کی تین وارداتیں ہوئی تھیں۔ یہ پہلی بار تھی کہ شیر کو زہر دیا گیا اور اس کے ساتھ ایک آدمی بھی مارا گیا۔

کپتان شکار کھیلے بغیر چلا گیا کیونکہ اُس کی چھُٹی ختم ہو گئی تھی۔ ہم نے جنگل کا پہرہ شروع کر دیا۔ پہرہ صرف دن کے وقت ہوتا تھا۔ رات کے وقت کوئی آدمی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ درندے رات کے وقت شکار کے لئے نکلتے تھے۔ تین دن بہت سارے آدمی جنگل میں گشت کرتے رہے۔ چوتھے دن کا واقعہ ہے کہ میں اکیلا جنگل میں گیا۔ مجھے حکم ملا تھا کہ میں جا کر دیکھوں کہ پہرے والے کہیں بیٹھ تو نہیں جاتے۔ میں ٹٹو پر سوار تھا اور میرے پاس سرکاری بندوق تھی۔ میں بہت دُور چلا گیا جہاں جنگل زیادہ گھنا تھا اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی تھیں۔ وہاں ایک

پتھریلا ٹیلا تھا۔ جنگل میں دُور تک دیکھنے کے لئے ٹٹو کو ٹیلے پر چڑھا لے گیا۔ وہاں سے مجھے ایک ندی نظر آئی۔ تقریباً دو سو گز دُور ایک جوان لڑکی درختوں میں سے نکل کر ندی پر گئی۔ وہ جنگل کے کسی ملازم کی بیٹی نہیں تھی نہ ہی جنگل میں کام کرنے والے کسی مزدور کی بیٹی تھی۔ اُس نے قیمتی کپڑے پہنے ہوتے تھے اور دُور سے وہ بہت خوبصورت نظر آتی تھی۔ ایسی لڑکی کبھی جنگل میں نہیں دیکھی جا سکتی۔ کوئی ایسی شکاری پارٹی بھی نہیں آئی تھی جس کے ساتھ لڑکی ہو۔ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ میں اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ کسی مری ہوئی لڑکی کی بد رُوح یا عورت کے رُوپ میں آئی ہوئی چڑیل لگتی تھی۔

لڑکی نے سارے کپڑے اُتار دیئے اور بالکل ننگی ہو کر ندی میں اُتر گئی۔ اُس کا جسم گورے رنگ کا تھا۔ پانی اس کے گھٹنوں تک تھا۔ وہ پانی میں بیٹھ کر نہانے لگی۔ وہ اکیلی تھی۔ کوئی اور عورت یا مرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورت نہیں۔ یہ ابھی غائب ہو جاتے گی یا مچھلی بن کر ندی میں گُم ہو جاتے گی۔ جنگل کے اس حصّے کے متعلق بہت سی ایسی باتیں مشہور تھیں کہ یہاں بد روحیں اور جن رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے جنگل کا کوئی ملازم اس طرف نہیں جاتا تھا۔ میری ملازمت سے پہلے، سُنا تھا کہ اس حصّے میں تین چار لاشیں ملی تھیں۔ کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ کس طرح مرے تھے۔ انہیں درندوں نے نہیں مارا تھا۔ میں ایسی ہی باتیں سُن سُن کر ڈرا ہُوا تھا، اس لئے آگے جانے کی بجاتے میں ٹیلے پر چڑھ گیا تھا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو دیکھا تو لوگوں کی باتیں سچ معلوم ہونے لگیں۔ میں نے ٹٹو کو باگ کھینچ کر موڑ لیا اور ٹیلے سے اُتر آیا۔ اس وقت میں جوان تھا۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جسم میں طاقت اور خون میں جوش تھا۔ بے شک میں جنوں سے نہیں لڑ سکتا تھا لیکن دل کہہ رہا تھا کہ بزدلوں کی طرح بھاگنا نہیں چاہیئے۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ لڑکی کس طرح غائب ہوتی ہے اور کون سا رُوپ دھارتی ہے۔

یہ سوچ کر میں نے ٹٹو کو ٹیلے کی دوسری طرف موڑ لیا جس طرف سے ندی گزرتی تھی۔ آگے گیا جہاں ندی کا موڑ تھا۔ وہاں سے مجھے درختوں میں سے وہ جگہ اچھی طرح منظر آ رہی تھی جہاں لڑکی نہا رہی تھی۔ ٹیلے سے اُترنے اور ندی کے موڑ پر پہنچنے تک تھوڑی دیر لگ گئی تھی۔ مجھے وہ جگہ تو اچھی طرح نظر آ رہی تھی لیکن لڑکی غائب تھی۔ میں درختوں میں سے اُسے نظروں سے ڈھونڈنے لگا۔ مجھے وہ جگہ یاد تھی جہاں لڑکی نے کپڑے اُتارے تھے۔ میں اس جگہ کو دیکھ رہا تھا کہ ایک ہرن وہاں ظاہر ہُوا۔ بہت خوبصورت ہرن تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ندی تک گیا۔ پانی پیا اور ہٹ کر جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ ہرن وہی لڑکی ہے اور اصل میں یہ جنّ ہے۔ مَیں نے کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا اور وہاں سے ٹٹو کو گھما لیا۔

ٹٹو آٹھ دس قدم چلا ہوگا کہ تقریباً پچاس گز سامنے ایک ریچھ کھڑا دیکھا۔ بہت بڑا ریچھ تھا۔ ریچھ اتنا دلیر نہیں ہوتا کہ انسان کو دیکھ کر کھڑا رہے۔ بھاگ جاتا ہے لیکن یہ ریچھ میرا راستہ روک کر کھڑا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے وہ میرا راستہ روک رہا ہے۔ مَیں نے ٹٹو روک لیا۔ میرے دل میں یہی ڈر بیٹھ گیا کہ یہ وہی جنّ یا بدرُوح ہے جو پہلے لڑکی بنا پھر ہرن بنا اور اب ریچھ کی شکل میں سامنے آگیا ہے۔ میرے پاس دونالی بندوق تھی لیکن میں دو وجہ سے بندوق نہیں چلا سکتا تھا۔ ایک یہ تھی کہ ہمیں درندے مارنے کی اجازت نہیں تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ریچھ دراصل جنّ یا بدروح تھا۔ اس پر گولی چلا کر میں خود نہیں مرنا چاہتا تھا۔

میں نے ٹٹو کو موڑ لیا اور دوسرے راستے پر چل پڑا۔ ریچھ وہاں سے چلا اور میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ میں نے ٹٹو روک لیا اور ریچھ کو جنّ سمجھتے ہوئے بلند آواز سے کہا — "مَیں غلطی سے اِدھر آگیا ہُوں۔ مَیں نے تمہارا کوئی نقصان نہیں کیا۔ میری غلطی معاف کر دو۔ مجھے جانے دو۔"

ریچھ وہیں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ اس وقت تک ٹٹو ریچھ سے نہیں ڈرا تھا۔ اچانک ریچھ نے منہ سے عجیب سی آواز نکالی اور وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کا قد بہت اُونچا تھا۔ اگر وہ اصل میں ریچھ ہی ہوتا اور مجھے اس پر گولی چلانے کی اجازت ہوتی تو مَیں اسے فوراً مار لیتا۔ اس نے اپنا سینہ پورے کا پورا آگے کر دیا تھا مگر مَیں مجبور تھا۔ ٹٹو نے ریچھ کی آواز سُنی اور اسے کھڑا ہوتے دیکھا تو بدک کر پیچھے کو مُڑا اور دوڑ پڑا۔ جانور درندوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ ٹٹو بھاگا تو میرے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ ریچھ یا وہ جو کچھ بھی ہے میرے پیچھے آکر مجھے اور ٹٹو کو مار ڈالے گا۔ میں نے ٹٹو کو قابو کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مُنہ زور ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی باگیں کھینچیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہُوا اور وہ ایک غلط طرف مُڑ گیا۔ درختوں کی ٹہنیاں میرے مُنہ کو لگ رہی تھیں۔ مَیں مضبوطی سے بیٹھا رہا۔ ٹٹو نہایت ہوشیاری سے درختوں اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا جا رہا تھا۔ میں نے یہ بھی ارادہ کیا کہ کسی درخت کا ٹہن پکڑ کر اس کے ساتھ لٹک جاؤں اور ٹٹو کو جانے دُوں لیکن ٹٹو تیز دوڑ رہا تھا۔

مَیں نے پیچھے دیکھا۔ ریچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر مجھے ڈر اس لئے زیادہ لگ رہا تھا کہ ٹٹو مجھے جنگل کے خطرناک حصّے میں لے جا رہا تھا جس کے متعلق میں نے خوفناک کہانیاں سُنی ہوئی تھیں۔ آگے جنگل گھنا تھا اور چٹانیں بھی تھیں جن میں سے بعض اُونچی تھیں اور بعض سیدھی دیواروں کی طرح تھیں۔ یہ جگہ دیکھ کر ہی ڈر لگتا تھا۔ اچانک بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں اور چھ سات بھیڑیئے کہیں سے آگئے۔

بھیڑیوں کو دیکھ کر ٹٹو یکلخت رُک گیا اور فوراً ہی رُخ بدل کر بھاگ اُٹھا۔ بھیڑیئے اسے گھیرنے کے لئے چاروں طرف ہو گئے۔ دو اُس کے سامنے سے روکنے لگے۔ میرا اب بچ نکلنا ناممکن تھا۔ میں کندھے سے بندوق اُتارنے لگا۔ عین اُس وقت ٹٹو نے تیزی سے رُخ بدلا اور

بائیں کو مُڑ گیا۔ میں سنبھل نہ سکا اور دائیں طرف گر پڑا۔ میں ایک گھنی جھاڑی میں گِرا اس لئے کوئی چوٹ نہیں آئی۔ بندوق کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں گری۔ میرا تو خیال تھا کہ تین چار بھیڑیئے مجھے دو منٹ میں چیر پھاڑ دیں گے لیکن خُدا نے مجھے بچا لیا۔ بھیڑیئے ٹٹو کے پیچھے چلے گئے۔ میں تھوڑی دیر جھاڑی میں چھپا رہا۔ ٹٹو کے قدموں کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں جو دُور چلی گئی تھیں۔ پھر میں نے ٹٹو کی ایسی آواز سُنی جیسے وہ سخت مصیبت میں ہو۔ بھیڑیوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اس کے بعد خاموشی ہو گئی۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ بھیڑیئے ٹٹو کو کھانے میں لگے ہوئے ہیں، اتنی دیر میں مجھے وہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ میں جھاڑی سے باہر نِکلا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بہت خوفناک جگہ تھی۔ ایک طرف اُونچی چٹان کی سیاہ دیوار تھی۔ باقی علاقہ درختوں سے بھرا ہُوا تھا۔ میں اپنی بندوق ڈھونڈنے لگا۔ یہ سرکاری بندوق تھی جو گُم کر دینے پر مجھے سزا ملتی۔ مَیں جُھک کر اِدھر اُدھر بندوق کو تلاش کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے آکر مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ مَیں نے جسم کو ایک طرف جھٹکا دیا لیکن وہ آدمی میری نسبت طاقتور تھا۔ کسی دوسرے آدمی نے میرے سر اور مُنہ پر کپڑا ڈال دیا اور گردن کے گرد معلوم نہیں کس طرح باندھ دیا۔

اور پھر اُنہوں نے میرے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر کے رسّی سے کس کر باندھ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک آدمی نے کہا —"خاموشی سے ہمارے ساتھ آجاؤ"— ایک نے میرے ایک کندھے پر اور دوسرے نے میرے دوسرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ چلانے لگے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اُنہوں نے مجھے کیوں پکڑا ہے اور مَیں نے انہیں یہ بھی کہا کہ مَیں غریب آدمی ہوں، مجھے پکڑ کر کیا کریں گے؟

"تم ہمیں پکڑنے آئے تھے"— ایک نے کہا —"ہم نے تمہیں

چٹان پر کھڑے دیکھا تھا۔"

مَیں انہیں بھی جِنّ سمجھنے لگا۔ مَیں ان کی منتیں کرتا گیا کہ وہ مجھے چھوڑ دیں لیکن وہ خاموش رہے اور دھکیلتے ہوتے آگے ہی آگے لے جاتے رہے۔ شاید ایک گھنٹہ گزر گیا تھا جب تھوڑی دُور سے کسی کی آواز سنائی دی —"ایک ہی ملا؟"— میرے ساتھ والے ایک آدمی نے جواب دیا —"ہاں۔ ابھی ایک ہی ملا ہے۔ باقی دُور رہتے ہیں۔ ادھر یہ اکیلا ہی آیا تھا۔"

مَیں دل میں دعائیں کرنے لگا کہ یا خدا، پہرہ دینے والے اِدھر آنکلیں اور مجھے بچالیں۔ اس کے ساتھ جب مجھے یہ خیال آیا کہ یہ انسان نہیں جِنّ ہیں جو انسانوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں تو میرے جسم کی طاقت ختم ہو گئی۔ پھر آواز آئی —"یہاں بٹھا دو"— میری آنکھوں پر کپڑا پڑا ہُوا تھا اس لئے دیکھ نہ سکا کہ کون ہے۔ آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہاں بہت سے آدمی ہیں۔ پکے ہُوئے گوشت کی خوشبو بھی آرہی تھی۔ مجھے بٹھا دیا گیا اور پوچھا گیا —"تم شیر کی کھال ڈھونڈ رہے ہو یا کھال اتارنے والوں کو؟"

"میں کچھ بھی نہیں ڈھونڈ رہا"— میں نے التجا کی اور کہا —"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔"

"گھبراؤ نہیں"— اُس نے کہا —"تمہارے سارے ساتھی یہاں آجائیں گے۔ ہم سب کو شیر کی کھال دیں گے۔ وہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم اُنہیں ڈھونڈ رہے ہیں"— اس نے اپنے آدمیوں سے کہا —"اسے وہیں پھینک دو۔ کل اس کی کھال اتار کر ڈاک بنگلے کے برآمدے میں پھینک آنا۔"

میں بہت ہی مجبور تھا۔ آنکھوں پر کپڑا اور ہاتھ پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوتے تھے اور یہ ڈر بھی تھا کہ یہ لوگ انسان نہیں کوئی اور ہی مخلوق ہیں۔ اُنہوں نے مجھے اٹھایا اور ایک طرف لے گئے۔ شاید

دو اڑھائی سو قدم دُور گئے ہوں گے کہ آگے چڑھائی آگئی۔ اُنھوں نے مجھے اُوپر کو دھکیلا۔ میں چڑھتا گیا۔ پھر انھوں نے میرے سر پہ ہاتھ سے دباؤ ڈال کر مجھے جھکا دیا اور آگے کو دھکیلا۔ تین چار قدم آگے جا کر انھوں نے مجھے سیدھا کیا۔ تھوڑی دُور آگے چلا کر مجھے بٹھا دیا۔ اُنھوں نے میری ٹانگیں لمبی کر کے ٹخنے اس سے باندھ دیئے۔ پھر میرے سَر اور منہ پر ڈالا ہُوا کپڑا کھول دیا۔ مَیں سمجھا کہ کپڑا بہت دیر آنکھوں پر رہنے کی وجہ سے اندھیرا ہے اور ابھی آنکھوں کو سب کچھ نظر آ جائے گا لیکن اندھیرا ویسے ہی رہا۔ اُس وقت مَیں سمجھا کہ یہ غار ہے۔ غار کا منہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ کوئی لمبا غار تھا۔ چوڑا اور اُونچا بھی تھا۔ آگے جا کر گھوم جاتا ہے۔

وہ آدمی چلے گئے اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ لوگ کون ہیں۔ کیا یہ جِنّ ہیں یا انسان ہیں؟ مجھے یہ یاد آگیا کہ پرانے ملازموں نے بتایا تھا کہ جنگل میں ڈاکو آکر چُھپا کرتے ہیں۔ میں جس زمانے کی بات سُنا رہا ہوں، یہ پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد کا زمانہ تھا۔ اُس وقت ہندوستان میں ڈاکوؤں کا بہت زور تھا۔ لوگ قافلوں میں سفر کرتے تھے اور اکثر لُوٹے جاتے تھے۔ ریل گاڑیوں پر بھی ڈاکے پڑتے تھے۔ جوان لڑکیاں اغوا ہوتی تھیں اور ڈاکو ایسے جنگلوں میں چھپا کرتے تھے۔ انگریز ان کے خلاف پولیس اور فوج کو استعمال کیا کرتے تھے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ یہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ ہے جو عارضی طور پر یہاں آچھپا ہے اور شیر کی کھال بھی انہی نے اُتاری ہے لیکن ندی والی لڑکی، ہرن اور ریچھ یاد آئے تو مجھے شک ہوگیا کہ یہ لوگ انسان نہیں اور جب مجھے یاد آیا کہ یہ لوگ میری کھال اُتاریں گے تو میرا دماغ بے جان ہوگیا۔ وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ خدا کو بہت یاد کیا۔ درود شریف یاد تھا وہی پڑھتا رہا۔ پڑھتے پڑھتے میرے دماغ میں آئی کہ اگر مرنا ہی ہے تو مَیں بُزدلی سے کیوں مروں۔ ذرا سا بھی موقع ملے تو میں لڑوں گا اور نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مجبور جانور کی طرح نہیں مروں گا۔ یہ شاید خدا کے کلام کا اثر تھا کہ میرا

دل دلیر ہوگیا۔ میں نے ٹانگیں اور بازو ہلا کر دیکھا۔ رسّیاں بہت پکّی بندھی ہوئی تھیں۔ پھر میں سرک کر پیچھے غار کی دیوار کے ساتھ ہوگیا اور پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں سے دیوار کو محسوس کرنے لگا کہ اگر وہاں کوئی کنارے والا پتھر ہو تو اس کے ساتھ ہاتھوں والی رسّی کو رگڑتا ہوں، شاید کٹ جائے۔ مَیں نے سرک سرک کر دیوار کو کسی جگہ سے ٹٹولا مگر کسی بھی جگہ نوکیلا یا تیکھے کنارے والا پتھر نہیں نکلا تھا۔

ادھر سے مایُوس ہو کر میں غار کے فرش پر کوئی اُبھرا ہُوا پتھر ٹٹولنے لگا مگر میری مراد پوری نہ ہوئی۔ اتنے میں باہر سے کسی کے اندر آنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ میں بیٹھا رہا۔ اب غار میں مجھے اتنا نظر آنے لگا جتنا رات کے اندھیرے میں باہر کھُلے آسمان کے نیچے نظر آتا ہے۔ دو تین سائے سے میرے قریب آئے۔ ایک نے میرے پاؤں کو ٹھوکر مار کر کہا۔ "کیوں رے؟ شیر کی کھال لا دوں؟ فکر نہ کر۔ کل تیری کھال تیرے صاحب کو دے دیں گے۔" میں چپ رہا۔ پھر اُس نے کسی کو دھکا دیا اور کوئی میرے قریب بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا۔ "ادھر سے بھاگنے کی نہ سوچنا۔ یہ چھوکری تجھے بتائے گی ہم کون ہیں"۔ اور سائے باہر کو چلے گئے۔

وہ چلے گئے تو مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ یہ کوئی عورت تھی جو میرے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ ہندو لڑکی ہے۔ چودہ پندرہ دن گزرے اس کی شادی ہوئی ہے۔ اس کی ڈولی اپنے گاؤں سے سُسرال کے گاؤں جا رہی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ ساتھ بیس بائیس باراتی تھے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ یہ لوگ پیدل جا رہے تھے۔ آدھے راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کیا۔ اُنھوں نے معلوم نہیں کتنے ہی باراتیوں کو قتل کر دیا۔ باقی بھاگ گئے۔ اس لڑکی کو ڈاکو اُٹھا لے گئے۔ زیورات اور نقدی بھی لُوٹ لی اور اس جنگل میں آگئے۔ اس لڑکی نے ابھی اپنے دُولہا کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ یہاں لا کر ڈاکوؤں کا لیڈر اسے روزانہ شام کے وقت شراب پلاتا اور پھر

اسے عیاشی کا ذریعہ بناتا تھا۔

لڑکی نے کہا — "وہ بہت طاقتور آدمی ہے۔ اس کے ساتھ سولہ آدمی ہیں۔ وہ اس کا غلاموں کی طرح حکم مانتے ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کو اجازت نہیں کہ مجھے بُری نظر سے دیکھے۔ اُس نے اس غار سے تھوڑی دُور بیلوں اور جھاڑیوں کی بڑی خوبصورت جگہ بنائی ہوئی ہے۔ ایک روز اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ مجھے نیچے بچھانے کے لئے شیر کی کھال چاہیئے۔ اس کے ساتھ شیر کا سَر بھی ضرور ہو۔ میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے اسے کہا کہ جنگل میں گولی چلائی تو پکڑے جائیں گے۔ زہر سے شیر کو ماریں گے۔ چار پانچ روز اس کے آدمی جنگل میں جاتے رہے لیکن شیر کی کھال نہ لا سکے۔ ایک روز اُنہوں نے اسے خبر سنائی کہ ایک شیر نے ان کا پھینکا ہوا زہریلا خرگوش کھا لیا ہے اور دوسرے دن وہ شیر کی کھال لے آئے جس کے ساتھ سر بھی ہے۔"

"آج ندی پر تم نہانے گئی تھیں؟" میں نے اس سے پُوچھا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا — "ایک آدمی مجھے روزانہ نہلانے کے لئے لے جاتا ہے۔ وہ چھُپ جاتا ہے اور میں کپڑے اُتار کر ندی میں چلی جاتی ہوں۔"

"تم نے وہاں ہرن دیکھا تھا؟" — میں نے پُوچھا۔

"نہیں" اس نے جواب دیا "میری حالت تو ایسی ہو گئی ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میں کہاں ہوں اور آگے پیچھے کیا ہے۔ یہ آدمی وحشی ہے —" وہ پھر رو پڑی۔

میرے شکوک رفع ہو گئے۔ ندی میں نہانے والی یہی مظلوم لڑکی تھی جسے میں جنّ اور بدرُوح سمجھتا رہا۔ ہرن اتفاق سے وہاں آ گیا تھا اور جس ریچھ نے میرا راستہ روکا تھا وہ بھی اتفاق تھا۔ میرا دماغ ٹھکانے آ گیا اور خون جوش مارنے لگا۔ میں نے پکّا ارادہ کر لیا کہ خود بھی نکلنے کی کوشش کروں گا اور اس لڑکی کو بھی نکال لوں گا۔ میں نے اس سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ اس نے بتایا کہ جب وہ اسے یہاں لاتے تھے تو دن رات اسے سردار اپنے ساتھ رکھتا تھا لیکن پانچ چھ دنوں سے اسے اس غار میں چھُپا دیتا ہے۔ تھوڑی سی دیر کے لئے باہر نکالتا ہے اور رات کو اسے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اس کے آدمیوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک آدمی کو قتل کر کے شیر کی کھال لائے ہیں۔ لڑکی یہ ساری باتیں سردار کے پاس بیٹھی سُن رہی تھی۔ ان لوگوں نے انگریز کپتان کو وہاں دیکھا تھا۔ تین ڈاکو قریب ہی کہیں چھپے ہوتے تھے۔ وہ شیر کا پیچھا کر رہے تھے۔ اُنہیں معلوم تھا کہ شیر زہر سے مرنے والا ہے۔ وہ اس کے مرنے کے انتظار میں چھُپے ہوتے تھے۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہم ایک آدمی کو وہاں چھپا کر واپس آ گئے تھے۔ ہم انگریز کپتان کے ساتھ وہاں سے دُور چلے گئے تو اُنہوں نے ہمارے آدمی کو قتل کر دیا اور شیر کی کھال اور سر اتار کر لے گئے۔

لڑکی نے ان کی ساری بات سُنی تھی۔ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ جنگل کی گارد نے گشتی پہرہ شروع کر دیا ہے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے آدمیوں سے کہا تھا کہ وہ پہرے داروں پر نظر رکھیں۔ اگر کوئی اس حصے میں آئے تو اسے پکڑ لائیں اور اسے قتل کر کے زمین میں دبا دیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ لڑکی کو سارا دن باہر نہ رکھا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس اچانک اِدھر آ نکلے۔ چنانچہ جس وقت ہمارے پہرہ دار جنگل میں گشت کرتے تھے، ڈاکو جھاڑیوں یا درختوں میں چھُپ کر انہیں دیکھتے رہتے تھے۔ صرف میں ہی بدقسمت تھا جو اِدھر آ نکلا۔ اگر ریچھ نہ ملتا تو میں ٹیلے سے ہی واپس چلا جاتا لیکن مجھے موت وہاں تک لے گئی۔

میں نے لڑکی سے پوچھا کہ غار کے باہر کوئی پہرے پر کھڑا ہوتا ہے؟ اُس نے بتایا کہ آج کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس سے پہلے وہاں کسی کا پہرہ نہیں ہوتا تھا۔ انہیں یقین ہو گا کہ لڑکی بھاگ کر جائے گی کہاں۔ وہ رات کے وقت درندوں کی ڈراؤنی آوازیں سُنتی رہتی تھی۔ ڈاکوؤں نے ایک لڑکی کو میرے پاس بٹھا کر یہ بھی نہ سوچا کہ وہ میرے ہاتھ اور پاؤں

کھول دے گی۔ اس سے مَیں سمجھ گیا کہ جنگل کے اس حصّے میں انہی کی حکمرانی ہے جہاں کے متعلق انہیں یقین ہے کہ کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ ورنہ وہ ایسی بے احتیاطی نہ کرتے۔

لڑکی نے کہا ـــ "اگر مجھے پتہ چل جاتے کہ اُنہوں نے شیر کو جو زہر دیا تھا وہ انہوں نے کہاں رکھا ہُوا ہے تو میں وہ کھا کر مر جاؤں۔ اس وحشی نے مجھے کہا تھا کہ رانیوں کی طرح عیش کرنا چاہتی ہو تو میرے ساتھ رہو لیکن میں نے اس کے پاؤں پر سر رکھ کر کہا تھا کہ مجھے گھر جانے دو۔ اُس نے کہا ہے کہ تم گھر نہیں جا سکو گی۔ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو میں تمہیں کسی نواب یا مہاراجے کے پاس بیچ دوں گا۔ سمجھ نہیں آتی کہ کیا کروں۔ یہاں سے کس طرح نکلوں۔"

اُس نے یہ بھی بتایا کہ رات کے وقت ایک آدمی اسے غار میں سے لینے آتا ہے اور اپنے سردار کے حوالے کر دیتا ہے۔ صُبح تک وہ اس کے پاس رہتی ہے۔ صُبح بہت دیر تک سوتی رہتی ہے۔ جب جاگتی ہے تو اسے ندی پر نہانے کے لئے لے جایا جاتا ہے۔ لڑکی نے میرے متعلق بتایا ـــ "جب تمہیں یہاں لے آتے تھے تو سردار نے اپنے آدمیوں سے کہا تھا کہ کل صُبح اسے قتل کر دینا اور اس کی کھال اور سر اُتار کر ڈاک بنگلے کے قریب پھینک آنا تاکہ جنگل کے دوسرے لوگ خوفزدہ ہو جائیں۔"

میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ فرار کے لئے تیار رہے۔

میں نے بہت دیر سوچ سوچ کر ایک ترکیب اپنے دماغ میں تیار کر لی۔ مجھے ڈر صرف یہ تھا کہ وہ ہندو لڑکی تھی۔ بزدلوں کی اولاد تھی۔ اگر مسلمان ہوتی تو مردوں کی طرح میرا ساتھ دیتی۔ مجھے اس لڑکی پر اعتبار نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میری رسّیاں کھول دے لیکن رسّیاں ٹخنوں اور کلائیوں پر اسی طرح لپٹی رہنے دے تاکہ کوئی اندر آکر ماچس جلا کر دیکھے تو وہ سمجھے کہ مَیں بندھا ہُوا ہوں۔ مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ میں زندہ نکل جاؤں گا لیکن یہ یقین ضرور تھا کہ بھاگنے کی کوشش کروں یا نہ کروں مجھے اب مرنا ہی ہے

ـــ لڑکی جُوں ہی میری رسّیاں کھولنے لگی باہر سے کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ وہ مجھ سے دُور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ ایک آدمی نے میرے اُوپر جُھک کر کہا ـــ "کل صبح تم آزاد ہو جاؤ گے" ـــ پھر اس نے لڑکی سے کہا ـــ "اس کا خیال رکھنا" ـــ لڑکی چالاک معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ہنس کر کہا ـــ "تمہارا کیا خیال ہے یہ بھاگ جائے گا؟" ـــ وہ چلا گیا۔ شاید مجھے ہی دیکھنے آیا تھا۔

اس کے جانے کے بہت دیر بعد لڑکی باہر نکل گئی۔ اس پر زیادہ پابندی نہیں تھی۔ ذرا دیر بعد واپس آئی۔ کہنے لگی ـــ "باہر کوئی نہیں ہے۔ سورج غروب ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد سب اکٹھے کھانا کھانے بیٹھیں گے۔ شراب پئیں گے۔ ڈاکے اور رہزنی کی باتیں کریں گے۔ پھر سردار ایک آدمی کو یہاں بھیجے گا جو مجھے اس کے پاس لے جائے گا۔ اس وقت نکلنا آسان ہوگا۔ بشرطیکہ تم اس آدمی کو قابو میں کر لو۔"

میں نے اسے کہا کہ رسیوں کی گانٹھیں کھول دے۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر میرے ہاتھوں اور ٹخنوں کی رسیوں کی گانٹھیں کھول دیں اور رسّیاں وہیں لپٹی رہنے دیں۔ میرا دل اُچھلنے لگا۔ اب میرا مقابلہ موت کے ساتھ تھا۔ میں نے پھر خُدا کے کلام کا وِرد شروع کر دیا۔ مجھے ابھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ صرف جوانی کا جوش تھا اور یہ غیرت کہ اس مظلوم لڑکی کو ان وحشیوں سے بچانا ہے۔ وقت آگے ہی نہیں ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا کہ ایک آدمی نے غار کے مُنہ میں سے آواز دی ـــ "چلو چھوکری" ـــ وہ اندر نہیں آیا۔ ہم نے ذرا انتظار کیا۔ اس نے وہیں سے پھر آواز دی ـــ "سو گئی ہو؟ جلدی آؤ" ـــ لڑکی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اسے سرگوشی میں کہا کہ وہ چُپ رہے۔ وہ چُپ رہی۔ مجھے اس آدمی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ قریب آکر اس نے ماچس جلائی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے لڑکی کا بازو پکڑا۔ لڑکی اُٹھی اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔ ماچس بُجھ گئی۔

میں نے رسیوں سے ہاتھ نکالے پھر ٹخنوں سے رسّیاں الگ کیں۔ گانٹھیں پہلے ہی کھلی ہوئی تھیں۔ میں اُٹھا اور اندھیرے میں پیچھے سے اس

آدمی کے دونوں ٹخنے مضبوطی سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچے۔ وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر دونوں گھٹنے رکھ دیئے اور اس کی گردن دبالی۔ لڑکی سے کہا کہ اس کی پگڑی اس کے منہ میں ٹھونس دو۔ اس نے اس کی پگڑی اتاری اور ذرا وقت لگا کر اس کے مُنہ میں ٹھونس دی۔ پھر میں نے اسے کہا کہ رسّیاں ڈھونڈو اور اس کے پاؤں باندھ دو۔ لڑکی نے اندھیرے میں ہاتھ مار کر رسّیاں اُٹھالیں۔ اس آدمی کی آواز تو نہیں نکل سکتی تھی لیکن ٹانگیں اتنی زور سے مار رہا تھا کہ لڑکی کے لئے اس کی ٹانگیں باندھنا مشکل ہو گیا لیکن وہ ہوشیار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اس کے ٹخنے باندھ دیئے۔ پھر میں نے اس کے ساتھ مل کر اس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے۔ اُمید یہی تھی کہ ابھی دو تین آدمی ہم پر پل پڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

ہم غار کے مُنہ تک آ گئے۔ باہر خاموشی تھی۔ لڑکی سے پوچھا کہ وہ لوگ کہاں ہیں اُس نے بتایا تو میں اسے ساتھ لے کر دوسری طرف چل پڑا۔ یہاں تک مجھے وہ آنکھیں باندھ کر لائے تھے اس لئے مجھے معلوم نہیں تھا کہ اپنا ٹھکانہ کس طرف ہے۔ لڑکی کو تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اس جگہ سے نکلنا چاہیئے۔ پھر کہیں راستہ مل ہی جائے گا۔ کچھ دُور تک ہم ذرا آہستہ چلتے رہے۔ بہت ہی دشوار راستہ تھا۔ راستہ تو دراصل کوئی نہیں تھا۔ جھاڑیاں، درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیاں، پرانے درختوں کی جڑیں اور موٹی موٹی بیلیں چلنے نہیں دیتی تھیں۔ اُونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں اور اندھیرا بھی، اور ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ میں خالی نہیں تھا اور میرے ساتھ لڑکی تھی جس کے پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ میں راستہ بناتا جا رہا تھا اور وہ میری پیٹھ کے ساتھ لگی چلی آ رہی تھی۔ میں دعا یہ مانگ رہا تھا کہ کوئی درندہ نہ مل جائے۔ لکڑبگوں اور بھیڑیوں کا خطرہ زیادہ تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ چل کر جنگل ذرا کم گھنا ہو گیا۔ درخت تھوڑی دُور تھے۔ اچانک شیر کی دھاڑ سُنائی دی۔ لڑکی چیخ مار کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ میں نے اسے ایک بازو میں لپیٹ لیا۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ اس

کا جسم کانپ رہا تھا۔ اتنی جوان اور خوبصورت لڑکی کو اپنے جسم کے ساتھ چپکا ہوا دیکھ کر میرا جسم بھی کانپنے لگا اور میں زیادہ دلیر ہو گیا۔ میں بھی جوان تھا مگر دل میں کوئی اُلٹا سیدھا خیال آنے کی بجائے یہ ارادہ پیدا ہُوا کہ یہ لڑکی میری عزّت اور غیرت ہے۔ میں اسے نہ بچا سکا تو میں بے غیرت ہو کر مروں گا۔

اس واقعہ کو آج پچاس سال گزر گئے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو یہ واقعہ کئی بار سُنا چکا ہوں اور انہیں یہ سبق دیا کرتا ہوں کہ اگر انسان دل میں عزّت اور غیرت کو زندہ رکھے تو وہ شیروں اور ڈاکوؤں کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے اور جب دل میں جرم اور گناہ کا خیال آ جاتا ہے تو جسم کی آدھی قوت اور دلیری ختم ہو جاتی ہے۔ خود میں نے اس واقعہ سے یہی سبق سیکھا ہے۔

میں نے اسے تسلّی دی اور کہا کہ اگر تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو تو دل میں مردوں والی دلیری پیدا کرو۔ یہ بھول جاؤ کہ تم عورت ہو۔ مگر وہ عورت ذات تھی اور وہ ہندو کی اولاد تھی۔ اس میں دلیری پیدا نہ ہوئی۔ میرے جسم سے وہ الگ ہوتی ہی نہیں تھی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ڈرایا کہ تیز چلو ورنہ وہ وحشی آ جائیں گے اور تمہارا بُرا حال کر دیں گے۔ یہ سُنتے ہی وہ چل پڑی۔ اُس نے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ آگے جھاڑیوں وغیرہ کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہمارے چلنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ بہت دُور جا کر چٹانوں نے راستہ روک لیا۔ سیدھا جانے کی بجائے ہمیں دو چٹانوں کے درمیان سے بائیں طرف راستہ بنانا پڑا۔ مجھے ڈر یہ لگ رہا تھا کہ کہیں گھومتے گھومتے میں پھر ڈاکوؤں کے پاس نہ پہنچ جاؤں۔ چٹانوں کے درمیان سے گزرتے ہم پھر دائیں طرف ہو گئے۔ لڑکی نے کہا — "مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ جسم ٹوٹ رہا ہے"۔ میں سمجھ گیا کہ اس درندے سردار نے اسے شراب پلا پلا کر اور اس کے ساتھ وحشیوں کی طرح سلوک کر کر کے اس کے جسم کا بہت بُرا حال کر دیا ہے ورنہ اُس زمانے میں اس کی عمر کی لڑکیاں بیس بیس میل

بغیر زُکے پیدل سفر کر جایا کرتی تھیں۔ وہ جسمانی طاقت کا زمانہ تھا مگر یہ لڑکی آدھی مری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ یہ دوسری مشکل تھی۔ وہ چلتی بھی کیسے؟ میں نے سوچا کہ اس کے پاؤں زخمی ہو چکے ہوں گے۔ اس سے پاؤں کے متعلق پوچھا تو وہ رونے لگی۔

میں اسے پھر بھی چلاتا رہا۔ اب ہم ایک چٹان کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ کوئی ایک میل دُور ایک شیر تھوڑی دیر بعد گرجتا تھا۔ ایک طرف سے لکڑبگوں کے چیخنے کی خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لکڑبگا دراصل چیختا نہیں، انسانوں کی طرح زور زور سے ہنستا ہے۔ کہیں بھیڑیئے بھی بھونک رہے تھے۔ ان درندوں میں سے کوئی بھی ہمیں ختم کر سکتا تھا۔ سارا جنگل ہمارا دشمن تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم دو میل چل چکے تھے اور تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ اچانک پیچھے سے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر باتیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور چٹان کی ڈھلان پر چڑھ گیا۔ وہاں جھاڑ زیادہ تھی۔ درخت بھی تھے۔ ذرا ہی اُوپر جا کر ہم دونوں ایک درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ جھاڑ کی اوٹ اچھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں چھ سات آدمی دوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ یہ ڈاکو تھے جو ہمارے تعاقب میں جا رہے تھے۔ اب ہمارا آگے جانا موت کے منہ میں جانے کے برابر تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ اُونچی بات نہ کرے۔ وہ اس قدر نڈھال تھی کہ میرے اُوپر گر پڑی۔ میں نے ٹانگیں لمبی کر کے اس کا سر اپنی رانوں پر رکھ لیا اور اسے لٹا دیا۔ وہ سو گئی۔

مجھے بھی اُونگھ آنے لگی لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں جاگتا رہا۔ بہت دیر ہوگئی۔ میں اس انتظار میں تھا کہ یہ آدمی جو آگے نکل گئے ہیں واپس آجائیں گے۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کسی دوسری طرف سے واپس چلے جائیں گے۔ مجھے یہ اطمینان ہوگیا کہ وہ اس طرف گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا ٹھکانہ اسی طرف ہے۔ لہٰذا میں صحیح راستے پر تھا۔ وہاں ایک ایک

منٹ گزارنا مشکل تھا۔ میرا خیال ہے کہ دو گھنٹے گزر گئے ہوں گے۔ مجھے بھیڑیوں کے بھونکنے اور غرّانے کی ایسی آوازیں سُنائی دینے لگیں جیسے وہ کسی شکار کے پیچھے دوڑ رہے ہوں۔ بہت تیز دوڑتے قدموں کی آوازیں تیزی سے ہماری طرف آرہی تھیں۔ اندھیرا تھا۔ پہلے شاید دو تین آدمی دوڑے ہوتے اس طرف چلے گئے جدھر سے میں آرہا تھا۔ ان کے پیچھے بھیڑیئے دوڑ رہے تھے۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے انسانوں کا واویلا اور چیخیں سُنائی دیں اور بھیڑیوں کی ایسی آوازیں جیسے اُنہوں نے شکار کو پکڑ لیا ہو۔ میں ان آوازوں کو بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ میرے لئے خدائی امداد تھی۔ یہ ڈاکو ہی تھے جو بھیڑیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ بھیڑیئے بھی لکڑبگوں کی طرح گروہ میں حملہ کرتے ہیں۔

لڑکی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ مجھے یہ تو تسلی ہوگئی کہ بھیڑیوں نے ان آدمیوں کو پکڑ لیا ہے اور بہت دیر تک انہیں کھانے میں مصروف رہیں گے لہٰذا میں نکل سکتا ہوں مگر یہ ڈر بھی پیدا ہُوا کہ بھیڑیوں کی آوازوں اور شکار کے گوشت کی بُو پر لکڑبگے بھی آسکتے ہیں اور شیر بھی۔ پھر بھی میں نے لڑکی کو جگایا اور اسے چلنے کو کہا۔ ہم ڈھلان سے اُترنے لگے تو اس کے پاؤں چونکہ زخمی تھے، اس لئے وہ پاؤں جما نہ سکی اور گر پڑی۔ ڈھلان زیادہ اُونچی نہیں تھی لیکن اسے چوٹیں آئیں اور جب میں نے اسے اُٹھا کر چلنے کو کہا تو وہ دو قدم چل کر رُک گئی۔ رو کر کہنے لگی کہ نہیں چلا جاتا۔ دراصل بیٹھنے اور سونے کی وجہ سے اس کے پاؤں کے زخم اور چوٹیں ٹھنڈی ہوگئی تھیں۔ اب اس کے چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے کندھے پر ڈال لیا اور چل پڑا۔ یہ ایک اور مشکل پیدا ہوگئی۔ میں یہ بوجھ اٹھاتے ہوئے چلتا رہا۔ اسے میں نے کندھوں پر اس طرح اُٹھایا ہُوا تھا کہ میں آگے کو جُھک گیا تھا۔ آگے دُور تک میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بھی ایک خطرہ تھا۔

میں چلتا ہی رہا۔ درندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ان پر کان لگاتے ہوئے تھا کہ کوئی آواز میری طرف تو نہیں آرہی۔ چٹانیں بھی راستے میں آئیں۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ آخر ٹانگیں جواب دینے لگیں۔

میں ٹانگیں گھسیٹنے لگا۔ ایک جگہ درخت کا تنا گرا ہوا تھا۔ میں دیکھ نہ سکا۔ ٹھوکر سے میں گر پڑا۔ اُٹھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا ٹانگوں کو آرام دیا اور اب پیاس نے پریشان کر دیا۔ لڑکی نے بھی کہا پیاس لگی ہے۔ میرا تو مُنہ کُھل گیا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ ندی کس طرف ہے۔ میں نے لڑکی کو کندھے پر ڈالا اور چلنے لگا۔ وقت کا اندازہ اس سے کیا کہ چاند نکل آیا تھا۔ چاند رات کے پچھلے پہر نکلتا تھا۔ میں چٹانوں میں گزر کر ذرا کھلے حصّے میں گیا تو کسی کی باتیں سنائی دیں۔ وہ ڈاکو ہی ہو سکتے تھے۔ میں نے پھر وہی داؤ کھیلا کہ قریب والی چٹان کی ڈھلان کے ساتھ دو ایسے درختوں کے پیچھے بیٹھ گیا جو آپس میں ملے ہوئے تھے اور کچھ پودوں نے اوٹ بنا رکھی تھی۔ چاند روشن ہو گیا تھا۔ چاندنی درختوں کی وجہ سے پوری روشنی نہیں دیتی تھی لیکن اب آدمی نظر آجاتا تھا۔ بالکل میرے قریب دو آدمی آکر رُک گئے۔ وہ اپنے سردار کو، لڑکی کو اور مجھے گالیاں دے رہے تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ سردار نے اُنہیں کہا ہے کہ لڑکی نہ ملی تو وہ سب کو مار ڈالے گا اور یہ بھی پتہ چلا کہ سردار خود بھی لڑکی کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ لڑکی نوجوان اور خوبصورت تھی۔ اسے کوئی بھی اپنے ہاتھ سے نکلنے نہ دیتا۔

میں نے ان دونوں آدمیوں کو دیکھا۔ ایک کے کندھے کے ساتھ بندوق لٹکی ہوئی تھی۔ دوسرے کے پاس تلوار تھی۔ لڑکی میرے ساتھ لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا کہ اس آدمی سے بندوق چھین لوں مگر وہ دو تھے۔ وہ بھی شاید میری طرح تھک گئے تھے۔ دونوں وہیں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ انہیں شاید ابھی پتہ نہیں چلا تھا کہ ان کے کچھ ساتھیوں کو بھیڑیئے کھا گئے ہیں۔ اُنہوں نے لڑکی کے متعلق بڑی غلیظ باتیں شروع کر دیں اور اپنے سردار کو گالیاں دینے لگے کہ وہ کسی اور کو لڑکی کے قریب نہیں جانے دیتا۔ وقت گذرتا رہا اور وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ وہ وہیں بیٹھ کر رات گزارنا چاہتے تھے، وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ دس گز دُور نیچے بیٹھے ہوتے تھے۔ درندوں کی آوازیں ختم ہو گئی تھیں۔ رات

گُزر گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہونے والی تھی۔ لڑکی سو گئی۔ میں نے نیند پر بڑی ہی مشکل سے قابو پایا۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا۔ ”ذرا سو نہ لیں؟“ ۔۔۔ دوسرے نے جواب دیا ۔۔۔ ”سو جاؤ یار۔ پھر چلیں گے“ ۔۔۔ میں نے دیکھا کہ وہ وہیں لیٹ گئے۔ جس کے کندھے کے ساتھ بندوق تھی، اس نے بندوق کندھے سے اُتار کر اپنے قریب رکھ دی۔

تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کر کے میں آہستہ سے اُٹھا اور کیڑوں کی طرح سرک سرک کر ایک طرف ہٹتا گیا۔ ان سے ذرا دُور ہٹ کر میں ڈھلان سے اُترا۔ کوشش یہ تھی کہ پاؤں کی آواز نہ آئے اور کوئی آہٹ نہ ہو۔ میں بیٹھے بیٹھے ان کی طرف بڑھا۔ آگے ایک درخت کا تنا تھا۔ میں اس تک پہنچا۔ وہ رات بھر کے جاگے ہوتے تھے اور گہری نیند سو گئے تھے۔ بندوق میری طرف والے پہلو کے ساتھ پڑی تھی۔ میں تنے کے قریب لیٹ گیا۔ وہاں سے ہاتھ لمبا کیا تو بندوق تک پہنچ گیا۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ اس میں کارتوس بھرے ہوتے ہوں گے۔ میں نے بندوق اُٹھائی۔ خاصی وزنی تھی کیونکہ دو نالی تھی۔ پوری طرح اُٹھ نہ سکی کیونکہ میں نے پیٹ کے بل لیٹے ہوئے بازو پورا آگے کر کے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بندوق گھسیٹ لی۔ اس کا مالک بیدار ہو گیا۔ وہ بہت تیزی سے اُٹھا میں نے اسی تیزی سے بندوق کھینچی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دوسرا آدمی بھی جاگ اُٹھا۔ بندوق والا ہوشیار تھا وہ بھاگ کر ایک درخت کے پیچھے ہو گیا۔ اس کا ساتھی اُٹھا تو میں نے اس پر گولی چلائی گولی نہیں۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے گھوڑے (ہیمر) چڑھاتے نہیں تھے۔ اُس زمانے میں ہیمر والی بندوقیں ہوتی تھیں۔ میں نے جلدی سے دونوں گھوڑے چڑھاتے۔ یہ آدمی اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اِدھر سے اس کے ساتھی نے اسے آواز دے کر کہا ۔۔۔ ”وہاں سے ہٹو“ ۔۔۔ اِدھر میں نے گولی چلا دی۔ یہ آدمی وہیں لٹو کی طرح گھوما اور گر پڑا۔ اُدھر سے لڑکی نے ڈر کر چیخ ماری۔

دوسرے کو دیکھا۔ وہ ایک درخت کے پیچھے ہو گیا تھا۔ میں اُٹھ کر سامنے آ گیا اور للکار کر کہا ـــ "سامنے آ جاؤ ورنہ ڈھونڈ کر گولی مار دوں گا"۔ وہ سامنے نہ آیا۔ البتہ دوڑنے کی آواز آئی اور ختم ہو گئی۔ میں اُس طرف دوڑا لیکن وہ کہیں دبک گیا تھا۔ میں اسے مارے بغیر بھی جا سکتا تھا لیکن ضرورت یہ تھی کہ بندوق تو مَیں نے اس سے لے لی تھی۔ کارتوسوں کی بیلٹ اُس کے پاس تھی۔ میرے پاس صرف ایک کارتوس تھا جو دوسری نالی میں پڑا تھا۔ وہ چلا کر بندوق صرف لاٹھی تھی۔ میں چھپ چھپ کر آگے بڑھنے لگا۔ ادھر لڑکی نے چیخ چیخ کر بُرا حال کر دیا تھا۔ مجھے یہ ڈر محسوس ہُوا کہ اسے کسی نے پکڑ تو نہیں لیا۔ میں اس کی طرف دوڑا۔ میرے دائیں طرف بھی کوئی دوڑا۔ میں نے رُک کر دیکھا۔ درختوں میں سے گزرتی ہوئی چاندنی میں مجھے وہ آدمی دوڑتا نظر آیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں نے بہت جلدی سے بندوق اُدھر کر کے گولی چلا دی۔ وہ دوڑتا رہا پھر گر پڑا۔ میں اُس کی طرف دوڑا۔ وہ اُٹھا اور چلنے لگا مگر چل نہ سکا۔ میں اُس تک پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا مجھے بخش دو۔ چھرّے اس کی ایک ران میں سے گزر گئے تھے۔ میں نے اس سے کارتوسوں کی بیلٹ لے لی اور بھاگتا ہوا لڑکی تک پہنچا۔ وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

میں نے اُسے چُپ کرایا اور کہا کہ اس کی آواز پہ باقی ڈاکو آ جائیں گے۔ مجھے وہاں سے جلدی نکلنا تھا۔ گولیوں کی آواز پہ ڈاکوؤں کے آ جانے کا خطرہ تھا جو صحیح ثابت ہُوا۔ لڑکی چلنے کے قابل نہیں تھی۔ مَیں نے اسے کندھوں پہ اُٹھانے سے پہلے چاندنی میں دیکھا کہ میں کہاں ہوں۔ یہ جگہ میں نے دیکھی ہوئی تھی۔ ابھی تک مَیں خطرناک علاقے میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ندی یہاں سے تھوڑی دُور ہے اور مگرمچھوں والی جھیل بھی ہے۔ میں نے اپنے راستے کا اندازہ لگایا اور لڑکی کو کندھوں پہ اُٹھا لیا۔ یہی میرے لئے مشکل تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو کبھی کا نکل گیا ہوتا۔ ذرا سی دیر بعد صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔ میرا اب پیاس اور تھکن سے یہ حال ہو گیا تھا کہ میں اگر

گھر میں ہوتا تو گر پڑتا۔ وہاں چونکہ خطرہ تھا اس لئے میں تیز چل رہا تھا۔ صبح کی روشنی دیکھی تو میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں چلتا گیا۔

اچانک میرے پیچھے سے گولی چلی۔ گولی کی سیٹی میرے قریب سنائی دی اور گولی میرے آگے زمین پہ لگی۔ یہ دھماکہ بندوق کا نہیں رائفل یا پستول کا تھا۔ یہ چھرّے نہیں تھے گولی تھی۔ میں تو اپنے آپ کو مُردہ سمجھ چکا تھا لیکن میرے قریب ایک درخت تھا۔ مَیں بھاگ کر اس کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کے پاس ہی چند فٹ اُونچی چٹان تھی۔ مَیں اس کے پیچھے چلا گیا۔ لڑکی کو بٹھا دیا اور بندوق کی دونوں نالیاں بھر لیں۔ مَیں نے اوٹ سے سامنے اور ہر طرف دیکھا۔ ایک گولی اور آئی جو میرے قریب لگی۔ مجھے کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ روشنی صاف ہوتی گئی کوئی ڈیڑھ سو گز دُور ایک آدمی ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر ایک طرف کو دوڑا۔ میں نے اس پہ فائر کیا لیکن نشانہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ایک اور درخت کے پیچھے ہو گیا اس نے منہ اور سر پگڑی میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ میری نظر اُس پہ رہی۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ میرے دائیں طرف سے دو گولیاں چلیں۔ فوراً دو اور گولیاں چلیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے للکار سنائی دی "ہوشیار ہو کے"۔ اس آواز سے میرے جسم میں جان آ گئی۔ یہ آواز جنگل کی گارڈ کے کسی ملازم کی تھی۔ میں نے اس آواز کے جواب میں کہا ـــ "او ہو آ ہو، آ ہو" ـــ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ ڈرے نہیں۔ وہیں بیٹھی رہے۔ اپنے آدمی آ گئے ہیں۔ میں آڑ میں ایک طرف کو سرکنے لگا۔ میں اس آدمی کو مارنا چاہتا تھا جو درخت کے پیچھے چھپا ہُوا تھا۔ میں رینگتے ہوئے اور چھپتے ہوئے کچھ دُور ہو گیا۔ وہ آدمی بہت ہوشیار تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا اور پستول سیدھا کر کے گولی چلائی مگر میں گولی چلنے سے پہلے ہی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ میں نے اس پہ گولی چلائی لیکن وہ درخت سے ہٹ کر چٹان کے اندر چلا گیا۔ میں اُٹھ کر اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔

کسی نے میرا نام پکارا اور کہا "رنگے ہوشیار ہو کے" ۔ میرا نام اورنگ زیب خان ہے۔ مجھے رنگا کہتے تھے۔ پھر آواز آئی ۔ "صاحب کہتا ہے زندہ پکڑو" ۔ میں رک گیا۔ میرے چار ساتھی آ گئے تھے۔ یہ اس روز کی گشت کی پہلی پارٹی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہیں حکم ملا تھا کہ مجھے تلاش کریں۔ ہمارا صاحب جو اینگلو انڈین مسٹر اینڈریو تھا، گارد کے ساتھ خود آیا تھا۔ یہاں وہ میری بندوق کی آواز پر اور پستول کی آواز پر آتے تھے۔ انہوں نے ڈاکوؤں کو دیکھ لیا اور مجھے بھی۔ صاحب نے ان چاروں کو پھیلا دیا۔ مجھے بھی ایک طرف بھیج دیا اور خود رائفل اٹھائے آگے بڑھنے لگا۔ ان سب نے اس آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ ہم اس جگہ کو گھیرے میں لے کر آگے بڑھنے لگے۔ دو آدمی اس چٹان کے اوپر چڑھ گئے جس کے پیچھے وہ چلا گیا تھا۔ میں دوسری سمت چلا گیا اور چٹان کے پیچھے جا پہنچا۔ مجھے وہ نظر آ گیا مگر اب گولی چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے اسے پکار کر کہا "پستول پھینک دو۔ اب بچ کر نہیں جا سکو گے" ۔ اس نے میری طرف گولی چلائی۔

دوسری طرف سے اسے اینڈریو صاحب نے بھی دیکھ لیا اور کہا کہ پستول پھینک دو۔ مگر اس نے ادھر بھی گولی چلائی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ گھیرے میں ہے۔ وہ پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ ایک اوٹ سے نکل کر دوسری اوٹ میں چلا جاتا۔ ایک بار اینڈریو صاحب نے اس کے قریب گولی ماری تاکہ وہ ڈر جائے لیکن وہ نہیں ڈرا۔ ذرا سا نظر آتا اور غائب ہو جاتا۔ ہم نیم دائرے میں آگے بڑھ رہے تھے۔ پیچھے ندی کی جھیل تھی۔ جھیل اونچی چٹانوں کی دیواروں میں گھری ہوئی تھی۔ ہماری طرف جو کنارہ تھا وہ بھی چٹان تھی مگر اس طرف سے میدان تھی۔ وہ آدمی پیچھے ہٹتا گیا۔ ایک بار نظر آیا۔ وہ اب جھیل کے کنارے پر کھڑا تھا۔ اینڈریو صاحب نے بلند آواز سے کہا —— "پیچھے مت ہٹو، مارے جاؤ گے" ——لیکن وہ پیچھے دیکھے بغیر پیچھے ہٹ گیا اور غائب ہو گیا۔ وہ جھیل میں گر پڑا تھا۔

اینڈریو صاحب اس کی طرف دوڑا۔ مجھے اس آدمی کی جھیل میں

سے چیخیں سنائی دیں۔ ہم سب دوڑ کر پہنچے۔ چھوٹے چھوٹے سات آٹھ مگرمچھوں نے اسے پکڑ لیا تھا اور اسے اپنی اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مگرمچھ اسے پانی کی تہہ میں لے گئے۔ اس کے بعد اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

میں نے واپس آ کر لڑکی اپنے صاحب کے حوالے کی۔ اسے سارا قصہ سنایا۔ جنگل کی تلاشی لی گئی۔ دو ڈاکو زخمی حالت میں ملے۔ چار لاشیں اس حالت میں ملیں کہ کھوپڑیاں اور جسموں کے کچھ حصے باقی تھے۔ انہیں بھیڑیوں نے کھایا تھا۔ دوسرے میرے ہاتھ سے مرے تھے۔ جسے ران پر چھرے لگے تھے وہ بھی مرا ہوا ملا۔ دو کو صبح گارد نے مارا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ اس نے بتایا کہ جو جھیل میں گرا اور مگرمچھوں کا نوالہ بنا ہے وہ ان کا سردار تھا۔ مگرمچھوں نے ایک معصوم دلہن کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا تھا اور جہاں ڈاکو ٹھہرے ہوتے تھے وہاں صرف شیر کی کھال اور چند ایک بیکار چیزیں پڑی تھیں اور جو کچھ تھا وہ شاید ان کے بچے کھچے ساتھی لے گئے تھے۔

لڑکی کو اس کے گاؤں چھوڑ آئے۔ مجھے ایک تو سرکاری انعام پانچ سو روپیہ ملا اور دو سو روپیہ لڑکی کے باپ نے دیا۔

میں گناہگار تو نہیں!

نائب صوبیدار جمال بخت

میں جو کہانی سُنانے لگا ہوں یہ جنگی کہانی نہیں، اِسے آپ بہم جُوتی کی کہانی سمجھ کر پڑھیں۔ جنگ تو اسے کہتے ہیں جو اپنے ملک کے لئے لڑی جاتی ہے اور جس میں مرنے والوں کو بہادر سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو کرائے کے سپاہی تھے جو شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی پٹھانوں کے خلاف اس لئے لڑتے تھے کہ انگریزوں کی بادشاہی اور زیادہ پھیل جائے اور اس کے عوض ہمیں زمین اور مربعے ملیں اور ہم باقی عمر پنشن کھاتے رہیں۔ میں آپ کو کوئی وجہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم مسلمان انگریز کی فوج میں کیوں بھرتی ہوتے تھے۔ بس ہم بھرتی ہو جاتے تھے اور صوبہ سرحد میں جا کر اپنے پٹھان بھائیوں کے خلاف لڑتے تھے۔ مجھ پہ لعنت بھیجنے سے پہلے یہ سُن لیں کہ پٹھانوں کے خلاف لڑتے وقت مسلمان سپاہیوں کا رویّہ بدل جاتا تھا۔ میں اُس وقت راجپوتانہ رائفلز میں نائک تھا اور دس بارہ مسلمان سپاہیوں کی سیکشن کا کمانڈر۔ میں جمعدار بن کر ریٹائر ہُوا تھا جسے آج کل نائب صوبیدار کہتے ہیں۔

مجھ سے قسم لے لیں کہ میری سیکشن نے کبھی نشانہ لے کر گولی چلائی ہو۔ بہت دفعہ پٹھان سامنے گولیاں چلاتے نظر آتے تھے لیکن خدا کو حاظر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میری سیکشن کی مشین گن اور تمام رائفلیں پٹھانوں

سے دس پندرہ گز اوپر فائر کیا کرتی تھیں۔ غیر مسلم سپاہی پوری توجہ سے لڑتے تھے اور بھاگنے میں بھی پہل کرتے تھے۔

میری پلٹن بنوں میں تھی۔ ہماری ایک کمپنی کھجوری کیمپ (قلعے) میں تھی۔ کھجوری بنوں سے سولہ سترہ میل دُور تھا۔ دونوں جگہوں کے درمیان سیدگی پوسٹ ہے۔ وہاں بھی ہماری پلٹن کی ایک کمپنی تھی۔ کھجوری قلعہ زیادہ خطرناک علاقے میں تھا۔ وہاں سے ہمیں پٹرول (گشت) کے لئے باہر وادیوں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ ہم جب پٹرولنگ کے لئے نکلتے تھے تو اگلوں پچھلوں سے گناہ قصور بخشواکر نکلتے تھے کیونکہ وادیاں تنگ پہاڑ اُونچے اور پٹھانوں کے لئے گھات لگاکر فائر کرنے کے لئے علاقہ نہایت اچھا تھا۔ کئی پٹرول پارٹیاں ایک دو سپاہیوں کی لاشیں وادیوں میں چھوڑ آتی تھیں۔

ان ہی وادیوں سے میری مہم جُوئی کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

ایک روز بنوں سے بیس پچیس گاڑیوں کا ایک کنوائے رزمک جا رہا تھا۔ سارے راستے میں پہاڑیوں پر اور وادیوں میں بریگیڈوں نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ اُوپر دو ہوائی جہاز اُڑ رہے تھے۔ اُس زمانے میں بنوں سے رزمک اور کوہاٹ سے بنوں تک ہفتے میں صرف ایک بار سڑک کھُلا کرتی تھی اور کنوائے بریگیڈوں کی حفاظت میں ایک منزل تک پہنچائے جاتے تھے۔ اسی طرح بیس پچیس گاڑیوں کا یہ کنوائے بنوں سے چل کر کھجوری کے علاقے میں پہنچا تو کسی پٹھان نے پہلی گاڑی کے ڈرائیور کو ایسی تاک کر گولی ماری کہ گولی شیشہ توڑ کر اس کی کھوپڑی سے پار ہو گئی۔ ڈرائیور نے مرتے مرتے سٹیرنگ گھما دیا ہو گا۔ گاڑی تیزی سے گھومی اور سڑک پر اُلٹ گئی۔

سڑک تنگ تھی۔ سارا کنوائے رُک گیا۔ سڑک کے ایک طرف اُونچا پہاڑ اور دوسری طرف ایک خشک نالے کی گہرائی تھی۔ کنوائے کسی طرف سے نہیں گزر سکتا تھا۔ چاروں طرف پہاڑیوں اور ٹیکریوں پر پھیلے ہوئے

بریگیڈ نے ہر قسم کے ہتھیاروں سے فائر کھول دیا۔ یہ فائر کنوائے کو پٹھانوں سے بچانے کی ایک کوشش تھی۔ پٹھان بریگیڈ کے علاقے میں کہیں چھُپے ہوئے تھے اور رُکے ہوئے کنوائے میں بیٹھے ہوئے فوجیوں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ فوجی گاڑیوں سے کُود کُود کر ٹیکریوں کے پیچھے اور گاڑیوں کے نیچے پناہ لے رہے تھے۔

اچانک پندرہ سولہ پٹھان گھات سے نکلے اور گاڑیوں پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُنہوں نے جو ہاتھ لگا، اٹھایا اور پہاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ اس سامان میں زیادہ تر ایمونیشن اور راشن تھا۔ دو پٹھان ایک گاڑی کے نیچے چھُپے ہوئے دو سپاہیوں کے ہاتھوں سے رائفلیں چھین کر لے گئے۔ میَں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بہادری کی ایسی مثال دنیا کی اور کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔

بعد میں معلوم ہوا تھا کہ پٹھانوں کا کچھ نہ کچھ جانی نقصان ضرور ہوا تھا جس کا ثبوت یہ تھا کہ ایک وادی میں جگہ جگہ خون بکھرا ہوا تھا۔ پٹھان اپنے شہیدوں کی لاشوں کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاتے تھے۔

چند دنوں بعد انگریزوں نے تین بریگیڈ جمع کر کے اِس علاقے کو سزا دینے کے لئے چڑھائی کر دی۔ بریگیڈ پہاڑیوں پر اور وادیوں میں پھیل کر اندر تک چلے گئے۔ جہاں کہیں کوئی جُھگّی جھونپڑا نظر آیا اسے توپوں اور ڈائنامیٹ سے تباہ کر دیا۔ کہیں کہیں فصل بھی کھڑے تھے، انہیں بھی تباہ و برباد کر دیا۔ پٹھان کا بچہ بھی نظر آیا تو اُسے گولی مار دی۔ دو پروں والے چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز سارا دن اِس علاقے میں بم برساتے رہے۔

شام تک تینوں بریگیڈوں نے اس علاقے پر خوب غصّہ نکالا اور پٹھانوں کا غصّہ پہلے سے زیادہ بھڑک اُٹھا جو اُنہوں نے کھجوری قلعے پر نکالنا شروع کر دیا۔ رات کے وقت قلعے کی دیوار پر سنتری گھُوما کرتے تھے۔ ان کے سامنے اتنی اُونچی دیوار ہوتی تھی جس کے اُوپر سے وہ باہر کے علاقے کو دیکھ سکتے تھے۔ قلعے کے چاروں کونوں پر پکے مورچے تھے جن

میں طاقتور سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ رات کے وقت تھوڑی تھوڑی دیر بعد سرچ لائٹوں کو جلا کر باہر کے علاقے کو دیکھا جاتا تھا۔ اب یہ حال ہوگیا کہ ایک ہی رات میں چاروں سرچ لائٹیں گولیوں سے ٹوٹ گئیں۔

ایک سنتری کی ایک کنپٹی میں گولی لگی اور دوسری کنپٹی سے نکل گئی۔ قلعے کے دو طرف اونچی پہاڑیاں ہیں جن پر چڑھ جاؤ تو قلعے کا اندرونی منظر نظر آتا ہے۔ دونو چوٹیوں پر اپنی پکٹیں تھیں۔ اس کے باوجود پہاڑیوں سے قلعے کے اندر گولیاں آنے لگیں اور دو دنوں میں چار سپاہی زخمی ہوگئے۔

کبھی کبھی تھوڑی دُور تک قلعے سے باہر گشتی پارٹی بھیجی جاتی تھی۔ ایک روز مجھے گشتی پارٹی لے جانے کا حکم ملا۔ میرے ساتھ میری کمپنی کے بارہ سپاہی تھے۔ یہ سب مسلمان تھے۔ مشین گن پلاٹون کی ایک بڑی (وکرمارک فور) گن ساتھ تھی جس کے "نمبر ایک" اور "نمبر دو" ہندو تھے۔ یہ پٹے والی بہت بڑی مشین گن ہوتی تھی جو ایک وزنی ٹرائپاڈ پر فِٹ کر کے فائر کی جاتی تھی اور اس کی نالی کو پانی سے ٹھنڈا رکھا جاتا تھا۔ یہ مشین گن بہت وزنی ہونے کی وجہ سے خچر پر لادی ہوتی تھی۔

اس طرح مشین گن کے آدمی اور ایک سگنلر ملا کر میرے ساتھ سولہ آدمی تھے اور ایک خچر۔ ہم قلعے سے کوئی تین میل دُور نکل گئے۔ ہم ٹیکریوں اور وادیوں میں پھیلے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں خاصہ داروں کی ایک پکٹ سے ملاپ کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ ہر طرف سب ٹھیک ہے، اور آگے چلے جاؤ۔ خاصہ دار سرکاری آدمی ہوتے تھے جو قبائلی پٹھان ہُوا کرتے تھے لیکن انگریز کے ملازم۔ ان کے پاس رائفلیں ہوتی تھیں۔ قبائلی ہونے کی وجہ سے انہیں آزاد قبائل کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا اور سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ قبائلیوں اور انگریزوں کے درمیان کبھی رابطے کی ضرورت محسوس ہوتی تو خاصہ داروں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پکٹیں بنا کر رہتے تھے اور فوجوں کو خطرے سے آگاہ کر دیتے تھے۔

میں بھی خاصہ داروں کی ایک پکٹ سے رپورٹ لے کر اپنی پارٹی کو آگے لے گیا۔ ان کی موجودگی میں مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں دراصل اپنی پارٹی کو بہت دُور لے جا کر اپنے انگریز کمانڈر کو فخر سے بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں کتنا بہادر ہوں اور کتنی دُور تک کے علاقے کی چھان بین کر آیا ہوں۔

مجھے خاصہ داروں پر ذرہ بھر شک نہ ہُوا کہ وہ مجھے ایسی مہم جُوئی میں دھکیل رہے ہیں جسے میں تا قیامت نہیں بھول سکوں گا اور جو گناہ کا کانٹا بن کر ساری عمر میری رُوح میں چبھتا رہے گا۔

میں اپنی پارٹی کو ساتھ لئے اور آگے نکل گیا۔ ہم صبح ساڑھے پانچ بجے قلعے سے نکلے تھے۔ اب بارہ بج رہے تھے۔ کھانا ساتھ تھا۔ ایک چشمے کے پاس بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ مارچ کا مہینہ تھا۔ وہاں مجھے دو تین سپاہیوں نے مشورہ دیا کہ اب واپس چلنا چاہئے ۔۔۔ کیمپ تک پہنچتے شام ہو جائے گی۔ میں نے مشورہ مان تو لیا لیکن واپسی کا راستہ بدل لیا۔ میں ان وادیوں کے ہیر پھیر سے واقف تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ میں کتنی خطرناک خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ تھوڑی دُور گئے تو دیواروں کی طرح کھڑی پہاڑیوں نے میرا راستہ روک لیا۔ پہاڑیوں کا رنگ سیاہی مائل تھا جن سے دل پر خوف طاری ہوتا تھا۔ یہ پہاڑیاں ننگی تھیں۔ نہ درخت نہ جھاڑی نہ گھاس کی ایک پتی۔ ایک طرف تنگ سا راستہ نکلتا تھا۔ میں نے اپنی پارٹی کو اُسی راستے سے واپس ہونے کو کہا جس راستے سے ہم اس ہَول میں داخل ہوتے تھے۔

ہم واپس چلے تو ہمارے سامنے تین تنگ وادیاں تھیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی یاد نہ رہا کہ ہم ان تینوں میں سے کون سے راستے سے آتے تھے۔ ہم اللہ کے بھروسے ایک وادی میں داخل ہو گئے۔ وہاں پتھر ہی پتھر تھے۔ اس لئے اپنے اور خچر کے پاؤں کے نشان بھی نہیں ملتے تھے۔

اتنے میں سیاہ کالی گھٹا چھا گئی اور گرجنے لگی۔ یہ موسم بہار کی گھٹا تھی جس میں بجلی بھی ہوتی ہے اور بجلی بڑی زور سے کڑکتی ہے۔ فوجی خچریں توپوں کے دھماکوں کی عادی ہوتی ہیں۔ ہماری خچر بجلی کے کڑکنے

سے تو نہ ڈری لیکن گھٹا کے اندھیرے میں جب بجلی چمکی اور کڑکی تو خچر شاید چمک سے بدک گئی اور سپاہی کے ہاتھ سے باگ چھڑا کر بھاگ اُٹھی۔ اس کے ساتھ ہی آسمان سے یہ مصیبت ٹوٹی کہ بارش کی بجائے اخروٹ جتنے موٹے اولے پڑنے لگے۔ یہ تو پتھروں کی بارش تھی جو تھمنے کی بجائے اور تیز ہوگئی۔ جسم پر اولہ پڑتا تھا تو دماغ بھی ہل جاتا تھا۔ اُس زمانے میں فوج میں ابھی سٹیل ہیلمٹ (فولادی ٹوپیاں) نہیں آئی تھیں۔ ہم خاکی کُلّے پر خاکی پگڑیاں باندھا کرتے تھے۔ پگڑیوں سے ہمارے سَر اَولوں سے بچے ہوتے تھے۔ ان اَولوں سے بچنا ضروری تھا ورنہ موت سامنے نظر آرہی تھی۔ میں کمانڈر تھا۔ مجھے صرف اپنا نہیں ساری پارٹی کا فکر تھا۔

مجھ پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ آپڑی کہ خچر باگ چھڑا کر بھاگ گئی تھی۔ اسے پکڑنا سب سے زیادہ ضروری تھا ورنہ میرا کورٹ مارشل یقینی تھا۔ اس پر مشین گن اور اس کا ایمونیشن لدا ہوا تھا۔ خچر بجائے خود قیمتی تھی۔ قبائلی علاقے میں خچر کا گم ہوجانا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی تھی۔ خچر بھاگی اور کسی ٹیکری کی اوٹ میں ہوگئی پھر سمجھئے کہ ہمیشہ کے لئے گئی کیونکہ یہ غیر علاقہ تھا جہاں کھلے بندوں پھرنا کسی پٹھان کی گولی سے مرنے والی بات تھی۔ حکم یہ تھا کہ بھاگتی خچر کے پیچھے دُور تک نہ جاؤ بلکہ اُسے دُور سے گولی مار کر سامان اتار لو تاکہ پٹھانوں کے ہاتھ نہ لگے۔ خچر گم کرنے والے عہدیدار کا کورٹ مارشل ہوتا تھا۔

مَیں نے نَو سال نوکری کر کے نائیکی کا عہدہ حاصل کیا تھا جو خچر کے ساتھ جاتا نظر آرہا تھا۔ اُوپر سے پتھروں کی طرح اَولے پڑ رہے تھے۔ ان سے خچر اور زیادہ تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ بجلی اس قدر زور سے چمکتی اور کڑکتی تھی کہ خچر کو دم نہیں لینے دیتی تھی۔ میں نے سپاہیوں سے کہا کہ پھیل جاؤ اور خچر کو پکڑو۔ اتنے زیادہ اَولوں میں یہ حکم ظالمانہ تھا لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خچر ہاتھ سے نکل گئی تو انگریز مجھ پر کیا ظلم

کرے گا۔

ہم سب خچر کے پیچھے بھاگے۔ خچر ایک ٹیکری کے پیچھے غائب ہوگئی۔ ہم بھی پیچھے گئے اور اسے دیکھ لیا' اَولے اور زیادہ موٹے اور تیز ہوگئے میرا ایک سپاہی اللہ جوایا (چکوال کا رہنے والا) بھاگتے ہوئے پھسل کر گر پڑا اور اس کے سَر سے پگڑی بھی گر پڑی۔ وہ سنبھل ہی رہا تھا کہ نہ جانے کتنے اَولے اس کے سَر پر پڑے اور وہ بیہوش ہوگیا۔ یہ یاد رکھئے کہ اَولے اخروٹوں جتنے موٹے تھے اور قریب سے نہیں آرہے تھے بلکہ آسمان سے گِر رہے تھے۔ دو اور سپاہی گِرے جن میں سے تحصیل گوجر خان کے کسی گاؤں میں رہنے والا سپاہی حسن دین تو اُٹھ کھڑا ہوا لیکن دوسرا نہ اُٹھ سکا۔ وہ مشین گن کا نمبر دو سپاہی ہیرا لال تھا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اُسی وقت مر گیا تھا یا بعد میں پٹھانوں کی گولی سے مرا تھا۔

مجھے اپنے سپاہیوں سے زیادہ خچر کا غم کھائے جا رہا تھا مگر خچر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میرے دوسرے سپاہی تو مختلف ٹیکریوں کے پیچھے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے اور میرے ساتھ مشین گن کا نمبر ایک رُوہتک کے کسی گاؤں کا رہنے والا لانس نائیک رادھے رام اور تحصیل پنڈ دادن خان کا ایک مسلمان سپاہی خدا داد خان تھا۔ ہم تینوں اَولوں سے اَدھ موئے ہونے کے باوجود منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے، خچر کو پکارتے، اندھا دُھند بھاگے جا رہے تھے۔

اچانک اَولے بند ہوگئے اور اس قدر تیز بارش شروع ہوگئی جو میں نے نہ کبھی دیکھی تھی نہ کبھی دیکھوں گا۔ اس بارش میں ہم دو مسلمان اور ایک ہندو پہاڑیوں اور ٹیکریوں کی بھول بھلیّوں میں خچر کو ڈھونڈتے اور بھٹکتے رہے۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میرے دوسرے سپاہی کہاں کہاں مارے مارے پھر رہے تھے۔ یہ علاقہ اس طرح آزاد پھرنے کے لئے بہت خطرناک تھا۔ مجھے صرف ایک تسلی تھی کہ اس قدر اَولوں اور اتنی تیز بارش میں پٹھان گھروں میں دبکے ہوتے ہوں گے۔

گھٹاؤں اور بارش کے اندھیرے میں مجھے وقت کا بھی کچھ خیال نہ تھا۔ بارش اور تیز ہوتی جا رہی تھی اور بجلی کی قیامت الگ تھی۔ مجھے ساتھ والی وادی میں ایک دھماکہ سنائی دیا۔ لانس نائک رادھے رام نے کہا۔ ”رائفل فائر ہوتی ہے“— میں نے اسے غصے میں جواب دیا ”جانگلی، بجلی کڑکی ہے“— خداداد نے بھی کہا— ”نہیں اُستاد، آواز رائفل کی تھی۔“

اتنی دیر میں دوسرا دھماکہ ہوا تو کوئی شک نہ رہا۔ یہ پٹھانوں کی ”درّے وال“ رائفل کی مخصوص آواز تھی بلکہ ایک دھماکے کی دو آوازیں— ”ٹک ڈم“— میں پھر بھی یقین نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن فوراً بعد دو اور دھماکوں نے مجھے یقین دلا دیا کہ انگریز کی فوج سے انتقام لینے کے لئے پٹھان اس طوفان میں بھی بیدار ہیں۔ اگر میں سپاہی ہوتا تو بھاگ اٹھتا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں نائک تھا اور پارٹی کا کمانڈر جس کی خچر مشین گن اور ایمونیشن کے پیٹوں سمیت بھاگ گئی تھی۔ ان ذمہ داریوں نے مجھے جان پر کھیل جانے پر مجبور کر دیا۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ پٹھان ایسی آڑ سے فائر کرتے ہیں جہاں وہ نظر نہیں آتے نہ ان کی پوزیشن کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ اگر میرے سپاہیوں پر فائر کرنے والے پٹھان مجھے نظر آ جاتے تو میں بلند آواز سے کہتا کہ ہم مسلمان ہیں۔ پٹھان مسلمان سپاہی کی جان بخشی کر دیا کرتے تھے۔ یہ ان کے اور ہمارے درمیان خاموش سا معاہدہ تھا کہ ہم ان پر نشانہ لے کر فائر نہیں کریں گے اور اگر انہیں علم ہو جاتے کہ ان کے مقابلے میں مسلمان ہیں تو وہ کوئی اور ٹارگیٹ تلاش کریں گے۔ مگر میں انہیں کیسے بتاتا کہ ہم مسلمان ہیں۔

دوسری صورت یہ تھی کہ پٹھان دست بدست لڑائی کے لئے سامنے آتے اور لڑنے پر ہی کمربستہ ہوتے تو ہم لڑ کر جانیں بچا لیتے لیکن گولیاں دُور سے آ رہی تھیں۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ باقی سپاہی ہیں کہاں؟ ذرا دیر بعد میرے سپاہیوں نے، جہاں کہیں وہ تھے جوابی

فائر شروع کر دیا جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ میرے سپاہی ایمونیشن پھونک کر بوجھ ہلکا کر رہے ہیں اور ان کی کوئی گولی نشانے پر نہیں جا رہی۔

لانس نائک رادھے رام اپنے آپ کو جنگجو راجپوت کہا کرتا تھا۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ قد لمبا اور چوڑا تھا جس سے وہ واقعی جنگجو لگتا تھا۔ بڑا قوی ہیکل جوان تھا اور سیاہ کالا۔ لیکن بارش میں بھیگا اور پٹھانوں کی گولیوں کی آواز سے ڈرا ہوا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ میرے قریب ہو کر ڈری ہوئی آواز میں بولا— ”جمال، یو تو پھیر ہو رہیا“— میں نے کہا— ”ہاں رادھے، یہ تو فائر ہو رہا ہے“— اُس نے پوچھا— ”اب کا کراں گے؟“— میں نے کہا— ”جو اللہ کو منظور ہوگا“— اُس نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا— ”جانے تیرے اللہ کو کا منجور ہو؟“— میں نے غصے سے کہا— ”بکو مت جانگلی، جوانوں کو تلاش کرو اور دشمن کو دیکھو“— وہ وہیں کھڑا میرا منہ دیکھتا رہا۔ بارش تیز ہو گئی تھی اور منہ پر کنکریوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ رادھے رام کو یُوں منہ کھولے کھڑا دیکھ کر میں نے اور زیادہ غصے سے کہا— ”مُوو MOVE“۔ وہ مجھ سے دو تین قدم پرے ہٹا ہی تھا کہ پٹھانوں کی تین چار رائفلیں دھاڑیں اور اس کے ساتھ ہی رادھے رام کود کر میرے ساتھ چپک گیا اور تھر تھر کانپتی آواز میں بولا— ”استاج (اُستاد) بڑی جور کا پھیر ہو رہیا۔“

سپاہی خداداد نے اُسے ننگی گالی دے کر کہا— ”چل میرے ساتھ۔ کراڑ اکیلے جاتے ڈرتا ہے“۔ خداداد اُس کے ساتھ چل پڑا تو مجھے اکیلے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ ایسے نازک وقت میں مجھے ایک ساتھی کی شدید ضرورت تھی جو صرف خداداد ہو سکتا تھا، رادھے رام نہیں۔ میں نے خداداد کو بھی جاتا دیکھا تو دونوں کو واپس بلا لیا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اب ہمارا حشر کیا ہوگا اس لئے میں کم از کم خداداد کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے سپاہیوں کو نام لے لے کر پکارنا شروع کر دیا لیکن

بارش کے شور کے ساتھ اب تیز ہوا کا شور بھی شامل ہوگیا تھا۔ پہاڑوں میں طوفان کا شور بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میری پکار کے جواب میں کسی کی آواز نہ سنائی دی۔ پھر ہم تینوں نے مل کر ایک ایک سپاہی کا نام پکارنا شروع کیا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ دونو طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی مگر میں اپنے سپاہیوں کی فائرنگ سے اندازہ کر رہا تھا کہ ان کی آدھی رائفلیں خاموش ہو چکی ہیں۔ سپاہی مر گئے ہیں یا بھاگ گئے ہیں۔ میری پارٹی میں ایک چھوٹی مشین گن (وی بی) بھی تھی۔ اس نے شاید دو یا تین برسٹ فائر کئے تھے۔ پھر اس کی آواز بھی سنائی نہ دی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کا گنر (بابری بانڈہ کوہاٹ کا رہنے والا داؤد شاہ) زندہ ہے یا پیچھے نکل گیا ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ فوراً مارا گیا تھا اور اس کی مشین گن پٹھان لے گئے تھے۔ اُس کی لاش بہت بُری حالت میں ملی تھی۔ درندوں نے کھالی تھی۔

ہم سپاہیوں کو پکار رہے تھے کہ ہمارے عقب سے ایک گولی آئی جو ہمارے سامنے ایک بہت بڑے پتھر پر پڑی۔ ہم تینوں نہایت تیزی سے پیچھے کو دَوڑ کر ایک ٹیکری کے ساتھ آڑ میں چھُپ گئے۔ پھر ایک گولی بائیں طرف سے آئی جو ہمارے سَروں کے اُوپر سے چیخ کر گذری اور پیچھے پتھروں میں لگی۔ بارش میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ دُور پرے سے اب میری پارٹی کی شاید دو ہی رائفلیں فائر کر رہی تھیں۔ پٹھانوں کی رائفل اور ہماری رائفل کے دھماکوں میں صاف فرق تھا۔

ٹیکری میں کٹا ؤ سا تھا۔ ہم رینگ کر اس میں سے پیچھے چلے گئے۔ اب ہم دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ اور گہری گلی میں جا پہنچے۔ معلوم نہیں کہ یہ گلی کتنی لمبی تھی۔ ہم نے اندھا دُھند ایک سمت چلنا شروع کر دیا۔ اگر دھوپ ہوتی تو میں مشرق مغرب کی سمت معلوم کر کے کیمپ کا رُخ کر لیتا۔ دو گولیاں ہمارے اُوپر سے چیختی گذر گئیں۔ رادھے رام دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ خداداد نے اُسے ننگی گالی دے کر چُپ کرانے کی کوشش

کی لیکن ہندوستان کا جنگجو راجپوت بچّوں کی طرح رو رہا تھا۔

اب ذرا میری مصیبت کا تصور کریں۔ میں پارٹی کا کمانڈر تھا۔ جانے کتنے سپاہی مارے جا چکے تھے۔ ان کے ہتھیاروں کا ضائع ہو جانا لازمی تھا۔ خچر مشین گن اور ایمونیشن سمیت بھاگ گئی تھی۔ اب اگر میں مارا جاتا تو بھی بُرا اور اگر زندہ کیمپ میں پہنچ جاتا تو بھی بُرا کیونکہ ایک مسلمان کو نقصان پہنچانے کے لئے ہندوؤں کو ایک موقع مل جاتا۔ یہ لوگ مجھے پہلے بھی ڈنک مار چکے تھے۔ مجھے کورٹ مارشل اور بدنامی سامنے نظر آ رہی تھی۔ میں دراصل پٹرولنگ کی حد سے دُور آگے نکل گیا تھا۔ یہ میرا جُرم تھا۔

ہم تینوں جس گلی میں جا رہے تھے وہ کوئی ڈیڑھ پونے دو گز چوڑی تھی اور اس کی قدرتی دیواریں بارہ چودہ فٹ اُونچی تھیں۔ ان کے اُوپر مٹیلے رنگ کے پہاڑ کھڑے تھے اور بارش بہت تیز ہو رہی تھی۔ پٹھانوں کی گولیوں سے بچنے کے لئے تو یہ گلی اچھی تھی لیکن یہ گلی سیدھی موت کے منہ میں جا رہی تھی۔ وہ اس طرح کہ مجھے ایسا شور سنائی دیا جیسے بے شمار گاڑیوں کا کنوائے چلا آ رہا ہو۔ بے شمار انجنوں کا شور۔ پہلے تو میں نے اسے طوفان کا شور سمجھا لیکن سامنے دیکھا تو ایسے نظر آیا جیسے ایک پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گلی میں بھاگا آ رہا ہو۔ غور سے دیکھا تو وہ مٹیالا اور سیلابی پانی تھا۔ سارے علاقے کا بارش کا پانی اِس گلی میں چلا آ رہا تھا۔ یہ اُوپر کے علاقے کا سیلاب تھا۔ ہم سے کوئی ڈیڑھ سو گز دُور، پتھر پانی کے آگے آگے تنکوں کی طرح بہتے چلے آ رہے تھے۔ گلی پانی سے بھری ہوئی تھی اور سیلاب بارہ چودہ فٹ کناروں تک چڑھا آ رہا تھا۔

سیلاب کی تیزی کو دیکھتے ہوئے ہمارے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ پیچھے کو بھاگ کر گلی سے نکل جاتے۔ میں نے خداداد کو چلّا کر کہا — "داد، سامنے دیکھو — سیلاب — نکلو" — خداداد عقل والا سپاہی تھا۔ وہ اُچک کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا اور تیزی سے بولا — "جمال، میرے کندھے پر کھڑے ہو جاؤ" — لیکن میں سب سے پہلے اسے باہر نکالنا چاہتا تھا۔

میں نے ذرا پس و پیش کی تو رادھے رام خداداد کے کندھے پر کھڑا ہو
گیا۔ خداداد سمجھا کہ اس کے کندھے پر میں ہوں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ رادھے
رام گلی کے کنارے پر پہنچ گیا اور لیٹ کر پرے سرک گیا۔ خداداد نے
مجھے اپنے پاس کھڑے دیکھا تو گھبرا کر بولا — "تم پھر نیچے آ گئے ہو؟" —
اُوپر دیکھا تو اُسے رادھے رام نظر آیا۔ خداداد نے رادھے رام کو اس
کی پھُرتی پر ماں کی نہایت غلیظ گالی دے کر خراجِ تحسین پیش کیا اور
پھر بیٹھ کر مجھے کہنے لگا "جلدی کرو یار، تم بھی جا نکلو۔"

سیلاب بیس پچیس گز دُور رہ گیا تھا۔ اب اُس کی آواز اور رفتار
ایسی تھی جیسے ببر شیروں کا گرجتا دھاڑتا غول منہ کھولے بھاگا چلا آ رہا
ہو۔ میں خداداد کے کندھے پر کھڑا ہُوا ہی تھا کہ وہ اُٹھا اور میرے
ہاتھ گلی بلکہ نالے کے بلند کنارے تک پہنچ گئے۔ میں اُوپر چلا گیا۔ اب
خداداد کو باہر نکالنا تھا۔ میں نے پیٹ کے بل لیٹ کر دونوں بازو نیچے
لٹکاتے اور خداداد سے کہا کہ اُچھلو اور میرے ہاتھ پکڑ لو۔ سیلاب دس
گز تک آن پہنچا۔ خداداد اُچھلا۔ اُس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے لیکن
بارش سے دونوں کے ہاتھ بھیگے ہوئے ہونے کی وجہ سے پھسل گئے اور
خداداد نیچے گر پڑا۔ میں نے نہایت تیزی سے رائفل کو اپنے دونوں ہاتھوں
میں اس طرح پکڑ کر نیچے کیا کہ رائفل زمین سے متوازی تھی۔ سیلاب
کا پہلا اور ذرا کم پانی خداداد کی ٹانگوں کو ڈبونے لگا۔

وہ اُچھلا اور اُس نے رائفل کو پکڑ لیا۔ جب میں اُسے اوپر کھینچنے
لگا تو میرا جسم آگے کو سرکنے لگا۔ تب معلوم ہُوا کہ میں ڈھلان پر لیٹا ہُوا
ہوں جس کا رُخ نالے کی طرف ہے۔ خداداد بھرپور جسم کا جوان تھا۔
اس کا بوجھ مجھے نیچے کھینچ رہا تھا۔ سیلاب کا زوردار ریلا خداداد سے آ
ٹکرایا اور اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹنے لگی۔ پانی اس کے کندھوں تک
پہنچ گیا۔ اُوپر سے میں سرک رہا تھا۔ نیچے خداداد سیلاب میں ڈوبتا جا
رہا تھا۔ اب سیلاب میں اس کا صرف منہ نظر آ رہا تھا۔ اُس کے بچنے کی
کوئی صورت نہیں تھی۔ سیلاب اتنا زیادہ اور اتنا تیز تھا کہ اگر ہم تین انسانوں

کی جگہ تین ہاتھی ہوتے تو وہ بھی بہہ جاتے۔ نالہ بہت تنگ اور زیادہ
ڈھلانی تھا جس سے پانی کی گہرائی اور زور بھی زیادہ تھا۔

رادھے رام میرے پاس بیٹھا جانے کیا بک رہا تھا۔ میں نے
اسے کہا کہ میری ٹانگوں پر بیٹھ جاؤ اور میری گردن کے قریب سے میرے
کندھوں کو پیچھے کھینچو۔ رادھے رام دُشمن کی لاش تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ
مجھے آگے نہیں سرکنے دے گا۔ خداداد جانے کس مشکل سے رائفل کو
مضبوطی سے پکڑے ہوئے سیلاب میں بہہ جانے سے بچنے کی کوشش
کر رہا تھا۔ اُوپر سے بارش کا زور بڑھ رہا تھا۔ اس قدر شور کہ ایک دوسرے
کی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے چلّا کر خداداد سے کہا کہ ناک
پانی سے باہر رکھو اور منہ بند۔ سیلاب اُسے مجھ سے چھین رہا تھا۔

رادھے رام میرے کولھوں پر بیٹھ گیا اور میرے کندھے تھام
لئے۔ وہ بڑبڑا رہا تھا — "ہرے رام۔ ہرے رام — شِو شمبھو۔ شِو شمبھو
— ہرے رام۔ ہرے رام" — میں نے چیخ کر غصّے سے کہا — "بکو مت
کراڑ کے بچے" — وہ یک لخت چُپ ہو گیا لیکن فوراً بعد اس نے دوسرا
وِرد شروع کر دیا — "یا اللہ۔ یا اللہ۔ یا علیؓ۔ یا علیؓ۔ حیدرؓ۔ علیؓ"

میرے جسم کو رادھے رام نے اچھی طرح جکڑ لیا۔ سوچنے اور سنبھلنے
کے لئے کوئی وقت نہ تھا۔ اب تو ہم سانسیں گن رہے تھے۔ پانی کی ایک
بے رحم لہر آئی جو میرے اور خداداد کے اُوپر سے گذر گئی۔ میں نے منہ
بند کر لیا۔ میں تو سمجھا کہ ہم سب ڈوب کر بہہ جائیں گے لیکن یہ لہر گذر گئی
ورنہ یہ کہانی سنانے والا کوئی بھی نہ رہتا۔ خداداد ڈوب کر اُبھر آیا۔ اس
نے ابھی رائفل کو نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔
اور وہ بہت مشکل سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ناک کو پانی سے نکال رہا
تھا۔ سیلاب چیختا چنگھاڑتا ہُوا گذر رہا تھا۔ میں نے خداداد سے کہا —
"داد، اللہ کا نام لو اور جھٹکا دے کر اُوپر آ جاؤ" — لیکن وہ سیلاب کے
زور کے آگے بے بس ہو گیا تھا۔ وہ بڑی اُداس آواز میں کہنے لگا —

”جمال بخت، خدا کے حوالے، مجھے چھوڑ دو۔ اپنی جان بچاؤ۔ تم بال بچے دار ہو۔“

میں نے بڑے زور سے کہا — ”داد، تجھے میرے بچوں کا واسطہ، رائفل کو نہ چھوڑنا۔ میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔“

میں نے رائفل کو اُوپر کھینچا۔ ساتھ ہی خداداد نے پاؤں نالے کی پتھریلی دیوار سے جما کر اُوپر زور دیا تو وہ کمر تک اُٹھ آیا۔ میں نے اور زور لگایا۔ میرے سینے کے نیچے کے پتھر میری پسلیوں کو توڑ رہے تھے اور خداداد کو سیلاب گھسیٹ رہا تھا۔ میں نے رادھے رام سے کہا کہ میرے کندھے چھوڑ دو اور میرے اُوپر لیٹ کر خداداد کی بغلوں میں ہاتھ رکھو۔ اچھا ہُوا کہ ہندو سمجھ گیا اور اُس نے میرے اُوپر لیٹ کر دونو ہاتھ نیچے کر کے خداداد کی بغلوں میں رکھ کر اُوپر کھینچا۔ اس کا لمبا قد کام آگیا لیکن اس کے اور خداداد کے وزن سے نیچے کے پتھر میری کھال میں اُترنے لگے اور پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ سیلاب کا زور اور زیادہ بڑھ گیا اور لہریں ہمارے اُوپر سے گُذرنے لگیں۔

خداداد بھی خُدا کو یاد کر رہا تھا۔ میں سورۃ یٰسین کا وِرد کر رہا تھا اور میرے اُوپر لیٹا ہُوا ہندو بھی وقتی طور پر مسلمان ہو گیا تھا اور ”علیؓ۔ علیؓ۔ علیؓ“ کا وِرد کر رہا تھا۔ میرے اللہ نے کرم کیا اور خداداد باہر آگیا۔ وہ ہمارے اُوپر گرا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ اُس نے کمال یہ کیا تھا کہ اپنی رائفل کو ضائع نہیں ہونے دیا تھا بلکہ اس کا سلنگ گلے میں ڈال کر رائفل کو بچا لیا تھا۔ میں نے اس کی رائفل کو دیکھ کر رادھے رام سے پوچھا کہ اس کی رائفل کہاں ہے؟ تو اُس نے بڑی بے پرواہی سے کہا — ”وہ تو رُڑ گئی استاج“ — جی میں آئی کہ اس ہندو کو دھکا دوں اور وہ بھی اپنی رائفل کے ساتھ رُڑ جاتے لیکن کافر میری پناہ میں اور میری ذمہ داری میں تھا۔

خداداد جلدی سنبھل گیا مگر میری پسلیوں میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

بارش ابھی تھمی نہیں تھی لیکن پٹھانوں کی گولیاں تھم گئی تھیں۔ سمت کا کچھ پتہ نہ تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تو پٹھانوں کی طرف سے تھا۔ وہ کسی وقت بھی کسی طرف سے گولی چلا سکتے تھے۔ اُنہوں نے ہم پر گولیاں چلائی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اُنہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اب خطرہ تھا کہ وہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ہماری وردیاں بھیگ بھیگ کر جسموں کے ساتھ چپک گئی تھیں۔ بوٹوں میں پانی بھر گیا تھا اور پگڑیاں اس قدر بوجھل ہو گئی تھیں کہ سر پر دزنی گٹھڑیوں کی طرح لگتی تھیں۔ ہم نے پگڑیاں اُتار کر جھولوں (فوجی بیگوں) میں ٹھونس لیں۔ رادھے رام نے پگڑی اتاری تو دیکھا کہ اُس کا سر باریک مشین سے منڈھا ہوا تھا اور اس کی ہندوؤں والی لمبی چٹیا صاف نظر آرہی تھی۔ یہ ہندوؤں کی صاف نشانی تھی جسے دیکھ کر کوئی پٹھان جان بخشی نہیں کیا کرتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ سر پر کوئی کپڑا لپیٹ لے یا سر پر کُلاّ رکھ لے۔ اُس نے اپنے جھولے سے رائفل صاف کرنے والا پٹی نما کپڑا نکالا اور سر پر لپیٹ لیا۔

ہم بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں چھپتے ایک سمت چل پڑے۔ رادھے رام میرے قریب آگیا اور ہاتھ جوڑ کر ہندوؤں کی طرح گڑگڑانے لگا — ”تجھے اللہ اور علیؓ کا واسطہ، میری جان بچا تیو۔ میرے چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں“ — وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ مجھے چھ فٹ لمبے اور ہٹے کٹے ہندو کو لیوں بُزدلوں کی طرح روتے دیکھ کر غصّے کی بجائے اس پر رحم آگیا۔ میں نے اُسے تسلّی دیتے ہوتے کہا — ”رادھے ہم دونو مسلمان اپنی جان دے دیں گے لیکن تجھے نہیں مرنے دیں گے۔“

ہم چلتے چلے گئے۔ سیلاب کا شور اور بارش پاگل کر رہی تھی۔ ہم نالے سے ہٹ کر ایک ٹیکری پر چڑھنے لگے۔ معلوم نہیں کہ ایک گھنٹہ گزر گیا یا کتنا وقت کہ ہم کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگتے چلے گئے۔ بارش تھمنے لگی۔ اس دوران ہم پر کوئی گولی فائر نہ ہوئی جس سے یہ تسلّی ہو گئی کہ پٹھان چلے گئے ہیں۔ میں بلندی پر جا کر اِدھر اُدھر دیکھنا چاہتا تھا کہ شاید

کہیں خاصہ داروں کی کوئی پوسٹ نظر آجاتے لیکن ہر طرف پہاڑیاں اور ہیبت ناک ویرانہ تھا۔

گھٹائیں تو آگے گذر گئیں اور آسمان پر سفید سفید بادل رہ گئے لیکن روشنی ہونے کی بجائے اندھیرا ہونے لگا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ میں نے ایک غلطی یہ بھی کی تھی کہ کمپاس اور نقشہ سگنیلر کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ سگنیلر کہاں تھا؟ مجھے کچھ علم نہ تھا۔ اب تو ہم کسی کو آواز بھی نہیں دیتے تھے کیونکہ پٹھانوں کا ڈر تھا۔

تھکن، بھوک اور بارش نے ادھ موا کر دیا۔ ہم ایک پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ ٹانگیں جسم کو اُٹھانے سے انکار کر رہی تھیں۔ جسم کی رگیں سو گئی تھیں۔ اس جسمانی حالت میں پٹھانوں کی گولی کا ڈر رہی سہی طاقت بھی ختم کر رہا تھا اور اسی ڈر کے مارے ہم سیدھے نہیں چل سکتے تھے۔ ہم آڑوں میں چھپ چھپ کر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ خداداد خوب ساتھ دے رہا تھا اور اس کی ہر بات سے دل مضبوط ہوتا تھا لیکن رادھے رام رہ رہ کر ہم دونو کی منّت سماجت کرتا تھا کہ اس کی جان بچائیں اسے یہ خطرہ تھا کہ ہم دونو مسلمان ہیں اور یہ علاقہ بھی مسلمانوں کا ہے، اس لئے ہم اس کی پروا نہیں کریں گے۔ میں اور خداداد اُسے کئی بار یقین دلا چکے تھے کہ ہم اسے بچائیں گے۔ آخر میں نے اللہ کی قسم کھا کر اسے کہا کہ میں اس کی خاطر جان پہ کھیل جاؤں گا۔"

میں اس امید پر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کوئی پٹھان نظر آجاتے تو اسے کہوں کہ ہم مسلمان ہیں اور اس امید پر بھی کہ شاید کہیں خچر ہی نظر آ جائے لیکن مجھے اُس وقت بتانے والا کوئی نہ تھا کہ ہماری خچر اور مشین گن کو پٹھان بہت دُور لے جا چکے ہیں۔

ہم پہاڑی کی چوٹی تک پہنچے تو بارش بالکل ختم ہو گئی۔ میں تو تھکن کا مارا ہوا تھا گر پڑا۔ جسم کا جوڑ جوڑ بُری طرح دُکھ رہا تھا۔ خداداد کی حالت مجھ سے بھی بُری تھی لیکن اُس نے کہا کہ لیٹ جانے سے کچھ حاصل نہ

ہوگا۔ جسم گرم ہیں بہتر ہے کہ چلتے چلو۔ یہ مشورہ اچھا تھا۔ ہم چل پڑے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو نوکیلی نوکیلی ٹیکریاں ہی ٹیکریاں نظر آ رہی تھیں۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ بادل کوئی ایسے گھرے تو نہیں تھے لیکن سورج نظر نہیں آتا تھا۔

ہم تقریباً نصف گھنٹے تک قدم گھسیٹتے رہے۔ ہم ٹیکریوں کے اُوپر بھی اور دامن میں بھی چلے۔ یہ انتہائی دشوار گذار پہاڑی علاقہ تھا۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ جسم مُردہ اور شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم اب دو اُونچی ٹیکریوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک کھُلی جگہ جا پہنچے۔ ایک طرف تھوڑی سی جگہ پر سبزہ نظر آیا۔ یہ چھوٹا سا کھیت تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس کے قریب آبادی یا ایک دو گھر ضرور ہوں گے۔ ہم جانتے تھے کہ یہاں ہمیں کوئی خوش آمدید نہیں کہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ خاکی وردی کو دیکھ کر کوئی گولی ہمارا استقبال کرے۔ پھر بھی یہ اطمینان ضرور تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔

بائیں طرف دو ٹیکریوں کے درمیان روشنی نظر آئی۔ اس کے پیچھے اُونچی پہاڑیاں تھیں جن سے شام کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ ہمیں اتنا ضرور دکھائی دیا کہ وہ پتھروں کا بنا ہوا ایک جھونپڑا ہے۔ ہم تیز تیز چلتے وہاں تک جا پہنچے۔ راستے میں رادھے رام نے کوئی بیس بار کہا — "استاج، پٹھانوں کو یہ نہ بتائیو کہ میں جات کا ہندو ہوں۔۔۔۔ اچھا استاج؟۔۔۔۔ اچھا کھداداد کھان؟ بتائیو یہ مسلمان ہے"— میں اور خداداد یہ تو فیصلہ کر ہی چکے تھے کہ اس اکیلے دھکیلے ہندو کو دھوکا نہیں دیں گے مگر ہم سے یہ بھول ہوئی کہ یہ نہ سوچا کہ اگر کوئی اس کا نام پوچھ بیٹھا تو کیا نام بتائیں گے۔ ہم نے یہ بھی نہ کیا کہ اسے کلمہ شریف ہی رٹا دیتے۔

ہم جھونپڑے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اندر سے ایک پٹھان باہر نکلا۔ ہمیں دیکھتے ہی بھاگ کر اندر گیا اور ایک دو لمحوں میں باہر آگیا۔ اب اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس کے ساتھ ایک بوڑھا پٹھان تھا۔ بوڑھے

کے پاس بھی رائفل تھی۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک عورت بھی باہر آتی۔ اس
کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ بوڑھے نے ہمیں پشتو میں للکارا۔ میں ایک لفظ
بھی نہ سمجھ سکا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس گز کا فاصلہ تھا۔ ہم رُک گئے۔
میں نے رائفل زمین پر پھینک دی۔ خداداد نے بھی رائفل پھینک دی۔
رادھے رام تو اپنی رائفل سیلاب میں پھینک آیا تھا۔

میں نے ہاتھ اُوپر اٹھا کر کہا "مسلمان"

بوڑھے نے غصّے سے کہا "کافر — کافر"

ہم انگریز کی عطا کی ہوئی خاکی وردی میں یقیناً کافر لگتے تھے۔ میں
نے کہا — "نہ — نہ — مسلمان — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ"
بوڑھا رائفل تانے آگے بڑھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے گھٹنے
چھوئے اور اُس سے ہاتھ ملایا۔ اسی طرح خداداد نے بھی بوڑھے کے
گھٹنے چھو کر مصافحہ کیا۔ لیکن رادھے رام پیچھے کھڑا ہمیں آنکھیں پھاڑے
دیکھتا رہا۔ خداداد نے اسے غصّے سے کہا — "آگے ہو کر اڑ دیا پُتڑا۔
ساڈی طرح اس پئو نال ہتھ ملا" — رادھے رام سدھاتے ہوئے
جانور کی طرح بوڑھے تک گیا اور اس قدر جُھک کر بوڑھے کے گھٹنے
چھوتے جیسے اس کے پاؤں چھونے لگا ہو۔ بوڑھے کی رائفل اس کے
دائیں ہاتھ میں تھی۔ جب رادھے رام ہاتھ ملانے کے لئے سیدھا ہوا تو
اُس کا سَر پہلے بوڑھے کے پیٹ سے رگڑ کھا گیا پھر اس کی رائفل سے ٹکرایا
جس سے اس کے سر پر لپٹا ہوا کپڑا اُتر کر گر پڑا اور ہندو کی نشانی لمبی
لمبی چٹیا سامنے نظر آنے لگی۔

بوڑھے نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور بڑی زور
سے بولا — "کافر... کافر — کافر —" پھر اُس نے ہم دونوں کی طرف
دیکھا اور اسی غصّے سے کہا — "کافر" — اور پھر نہ جانے اُس نے پشتو
میں کیا کچھ کہا۔ وہ ہم دونوں کو بھی کافر سمجھ رہا تھا۔

دوسرا پٹھان نوجوان تھا۔ وہ بھاگ کر آگے آیا۔ اُس نے ہماری

رائفلیں اُٹھا لیں اور پشتو میں نہ جانے کیا کہتا ہوا ہمیں نفرت سے
ہانک کر جھونپڑے کے اندر لے گیا۔ جھونپڑے کے اندر دیا جل رہا تھا۔
ہم ابھی کمرے میں کھڑے کچھ دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ کتے کی غرّانے
کی آواز آئی اور بھیڑیئے کی طرح کا ایک کُتا اٹھتا نظر آیا۔ بوڑھے نے کُتے
کو کچھ کہا۔ کُتا تیزی سے ہماری طرف آیا اور ہمارے گرد گھوم کر ہمیں
سونگھنے لگا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ ہمارے فرار کے خلاف کارروائی ہو
رہی ہے۔ یہ مُشک لینے والا شکاری کُتا تھا جسے ہمارے جسموں کی بُو
سے آشنا کیا جا رہا تھا۔

ہم پشتو نہیں سمجھتے تھے اور ہمارے میزبان اُردو سے ناواقف
تھے۔ ہمیں زمین پر بٹھا دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ نوجوان اور بوڑھی عورت
بہت خوش ہیں اور ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔
بوڑھا ہم سے شاید اقبالِ جُرم کرانا چاہتا تھا کہ ہم ہندو ہیں۔ خوش قسمتی
سے دادا جان نے مجھے سورۃ یٰسین یاد کرا رکھی تھی۔ میں نے ترنّم سے اس
سورۃ کی قرأت شروع کر دی۔ اس کا اثر صاف نظر آیا۔ بوڑھے اور اس
کے کُنبے پر وجد طاری ہو گیا۔ اس کے بعد خداداد نے ساری کی ساری نماز
اور تیسویں پارے کی سورۃ قُل اعوذ برب الناس سُنا دی۔ اسے یہی کچھ
یاد تھا۔

اُس وقت مجھے خیال آیا کہ رادھے رام بدقسمت کو کم از کم ایک کلمہ ہی
یاد کرا دیتے تو شاید پٹھان مان جاتے کہ وہ بھی مسلمان ہے۔ بوڑھے نے
اسے اشارہ کیا کہ تم بھی مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کرو۔ رادھے رام
نے گھبرا کر پہلے مجھے دیکھا پھر خداداد کو۔ پھر بوڑھے کی طرف دیکھا اور اُس
نے بچوں کی طرح "ڑاں ڑاں" کی آوازیں نکالتے ہوئے رونا شروع کر
دیا۔ وہ گدھے کی طرح ہینگ رہا تھا اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔
بوڑھی عورت اور نوجوان پٹھان قہقہہ لگا کر ہنسے اور ہمیں بھی ہنسی آگئی
لیکن بوڑھے کا غصّہ بھڑک اُٹھا۔ اُس نے رادھے کی طرف اشارہ کر کے

مجھ سے پُوچھا — "کافر؟" — میں کیا جواب دیتا؟ میں نے سر ہلا کر کہا — "ہاں۔"

رادھے رام نے یہ سوال اور جواب سُنا تو وہ دھاڑیں مارنے لگا اور دونوں ہاتھ میرے پاؤں پر رکھ کر کہنے لگا — "اے جمالے، کہاں لا کے مارا گریب کو۔ اے اُستاج، تیرے اللہ کو یہی منجور تھا کیا؟" — میں نے راز کھُل جانے کے باوجود اُسے تسلی دی اور کہا کہ خواہ مجھے اپنی جان دینی پڑے تجھے ضرور بچا لوں گا۔ خداداد نے اسے گالیاں دے کر چُپ کرایا اور کہا کہ ذرا حوصلہ قائم رکھو۔

بوڑھے نے اسے ہم سے الگ کر کے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا اور ہمیں معلوم نہیں کیا کہا۔ میں اس کے لب و لہجے سے اتنا ضرور سمجھ گیا کہ بوڑھا ہم دونو مسلمانوں کی جان بخشی کر دے گا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے پیٹ کے ساتھ لگایا پھر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کچھ پوچھا۔ میں سمجھ گیا اور سر ہلا کر کہا کہ ہاں، ہم بھوکے ہیں۔ اُس نے عورت سے کچھ کہا تو وہ کمرے کے ایک کونے سے چنگیر اُٹھا لائی۔ اس میں بڑی بڑی روٹیاں تھیں۔ پھر وہ مٹی کی بڑی رکابی میں سالن لائی۔ یہ دال تھی، لیکن یہ نہ پتہ چلا کہ کونسی دال ہے۔ بہت لذیذ تھی۔ بوڑھا، نوجوان، میں اور خداداد ایک ہی رکابی میں کھانا کھانے لگے۔ ہم دونو نے پہلا نوالہ توڑتے وقت بلند آواز سے بسم اللہ شریف پڑھی۔ رادھے رام دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ بوڑھے نے ایک روٹی پر دال ڈال کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ خداداد نے اسے کہا — "کھا پہلوان، ہم تمہیں بچا لیں گے۔"

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ ہم کھانا کھا چکے تو بوڑھے نے چونک کر نوجوان سے کچھ کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر دونو ہاتھ کانوں تک لے گیا اور بولا۔ "نماز۔" ہم دونو نے بُوٹ اتار دیئے، وضو کیا اور بوڑھے اور نوجوان کے ساتھ فرش پر بچھی ہوئی خشک گھاس پر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہوتے تو بوڑھے نے نوجوان سے کچھ کہا تو نوجوان اپنی رائفل اُٹھا

کر باہر نکل گیا۔ رادھے رام مجھ سے طرح طرح کی باتیں پُوچھ رہا تھا اور میں اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد نوجوان واپس آ گیا۔ اُس کے ساتھ پختہ عمر کا ایک لمبا تڑنگا پٹھان تھا۔ اُس نے السلام علیکم کہی اور بڑے تپاک سے ہمیں ملا، وہ اُردو بولتا تھا۔ اُس نے کہا۔ "اِن لوگوں نے مجھے بہت دُور سے بلایا ہے۔ یہ اُردو نہیں بول سکتے" — اِس کے بعد اُس نے ہمارے ساتھ باتیں شروع کر دیں اور ہمیں بتایا کہ اس نوجوان کا نام آدم گُل ہے۔ یہ بوڑھا اس کا باپ اور عورت اس کی ماں ہے۔ وہ خود آدم گُل کا ماموں تھا۔

اس کے لب و لہجے اور باتوں میں خلوص اور اُنس تھا۔ لیکن ایک گلہ بار بار کرتا تھا کہ مسلمان بھی انگریز کی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں اور جب ہماری گولی سے کوئی مسلمان مر جاتا ہے تو ہمارے دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ مسلمان سپاہی کبھی کسی پٹھان کو رائفل یا مشین گن کا نشانہ نہیں بناتے اور فائر کرتے وقت ہتھیاروں کی نالیاں اُونچی یا بہت نیچی رکھتے ہیں۔

باتوں باتوں میں وہ ہمارے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ میں نے اُسے صحیح صحیح سُنا دیا کہ ہم پر آج کے دن کیا گذری ہے اور اُسے یہ بھی بتایا کہ کیمپ میں واپس جا کر مجھ پر کیا گذرے گی۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا ہمیں بہت جلدی کھجوری پوسٹ میں پہنچ جانا چاہیئے ورنہ صرف میری ہی نہیں بلکہ پلٹن کے تمام مسلمانوں کی بے عزتی ہو گی۔ پٹھان نے کہا — "دیکھو دوست ہم تم دونو کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ تم دونو مسلمان ہو۔ تم ہمارے گھر میں مہمان ہو۔ تم نے ان لوگوں کے ساتھ ایک رکابی میں کھانا کھایا ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ اب ہم پر فرض ہو گیا ہے کہ تمہیں اپنی حفاظت میں کھجوری تک پہنچا آئیں ورنہ ہم کافر ہو کر مریں گے۔"

میں نے اُس سے باتوں باتوں میں پوچھ لیا کہ کھجوری کیمپ کس طرف ہے اور ہم کیمپ سے کتنی دُور ہیں۔ اُس نے کہا "تم خواہ مخواہ چکر میں پڑے رہے۔ کھجوری کیمپ یہاں سے صرف تین میل دُور ہے۔" اُس نے ہمیں راستہ اور سمت بتا دی۔ اُس نے آدم گُل کو پشتو میں کچھ کہا تو آدم گُل نے رادھے رام کو بازو سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔ اس پر ہندو راجپوت پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ آدم گُل کے ماموں نے اسے کہا "کافر کے بچے، انگریز نے تمہیں اسی لئے راشن کھلا کھلا کر خنزیر بنایا ہے کہ پٹھان کی گولی سے مرو۔ روتا کیوں ہے حرام خور" — رادھے رام لیٹ گیا اور اس قدر زور زور سے رونے لگا کہ کُتا بھی غرّانے لگا۔ میں نے پٹھان سے پوچھا کہ اسے کہاں لے جاؤ گے تو اُس نے کہا کہ تمہارے ساتھ ایک ضروری بات کرنی ہے جو میں اسے نہیں سنانا چاہتا اسے کہو ذرا دیر کے لئے باہر چلا جائے۔

میں نے اور خُداداد نے اُسے بڑی مشکل سے باہر جانے پر رضامند کیا، وہ تھر تھر کانپتا آدم گُل کے ساتھ باہر چلا گیا۔ دراصل یہ ڈر مجھے بھی تھا کہ اسے باہر لے جا کر گولی مار دیں گے۔

"بات یہ ہے" — آدم گُل کے ماموں نے کہا "ہم اس کافر کو ضرور گولی ماریں گے۔"

"نہ خان صاحب" میں نے منّت کی "یہ میری پناہ میں ہے۔ اس نے مجھ سے اللہ کا واسطہ دے کر وعدہ لیا ہے کہ میں اس کی جان بچاؤں گا۔ اگر تم نے اسے مار دیا تو سمجھو کہ مجھے مار دیا۔ یاد رکھو خان۔ درمیان میں اللہ ہے۔"

لیکن وہ ہندو کو بخشنے پر راضی نہ ہُوا۔ میں نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے خود کہا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ ایک رکابی میں کھایا اور اُن کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور اگر ہمیں کوئی نقصان پہنچا تو وہ کافر ہو کر مریں گے۔ اُس نے کہا "دیکھو دوست، تم کو اصل بات بتا دوں کہ ہم اس ہندو کو

کیوں مارنا چاہتے ہیں۔ ہم آدم گُل کی شادی کر رہے ہیں۔ رشتہ مِل گیا ہے لیکن لڑکی والوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ لڑکا پانچ انگریزوں یا سکھوں یا ہندوؤں کی لاشیں اپنی رائفل سے ماری ہوئی لاتے تو وہ ان لاشوں کے عوض اسے بیٹی کا رشتہ دے دیں گے۔"

"عجیب شرط ہے!" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ لڑکی کے دو بھائی جہاد میں اکٹھے شہید ہو گئے ہیں" اُس نے کہا "ان کے باپ نے پہلے کہا تھا کہ بیس کافروں کی لاشوں کے عوض رشتہ دوں گا۔ ہم نے اسے کہا کہ ہمارا لڑکا پچاس دفعہ جہاد میں جا چکا ہے۔ تھوڑا عرصہ ہُوا اس نے کھجوری کے قریب ایک کنوائے پر بھی حملہ کیا تھا۔ وہ اب تک معلوم نہیں کتنے کافروں کو مار چکا ہے لیکن کسی کافر کی لاش نہیں لا سکا۔ کچھ اور لوگوں نے بھی سفارش کی کہ کچھ رعایت کرو۔ آخر لڑکی کا باپ مان گیا۔ پہلے تو دس لاشیں کہنے لگا، پھر پانچ لاشوں پر راضی ہو گیا۔ پچھلے تین مہینوں میں یہ چار لاشیں لا کر ہونے والے سُسر کو دکھا چکا ہے۔ دو سکھ تھے اور دو ہندو۔ اب خدا نے ایک ہندو اس کے گھر میں بھیج دیا ہے جسے مار کر وہ لڑکی والوں کے گھر بھیج دے گا اور اگلے روز مولوی صاحب کو بلا کر نکاح پڑھوا لے گا۔"

میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہندو کو ضرور مرنا چاہیئے، یہ گوارا نہ کیا کہ میرے جیتے جی وہ مر جاتے۔ میں نے پٹھان سے کہا کہ اسے مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے زندہ ہی بیٹی والوں کے سامنے پیش کر دو۔

"پھر لڑکی والے خود اسے گولی مار لیں گے" اُس نے کہا "یہ بچ تو نہیں سکتا۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟" میں نے خفگی سے کہا "میں بھی تمہارا قیدی ہوں۔ نہتّے آدمی کو گولی مارنا مردانگی نہیں۔"

"خدا تم کو عقل دے، یہ آدمی نہیں یہ ہندو ہے" آدم گُل کے ماموں نے کہا "ہندو نہتّہ ہوتا ہے تو اسی طرح روتا ہے جیسے یہ کافر

رو رہا ہے۔ جب اُس کے ہاتھ میں ہتھیار آجاتا ہے تو تمہاری پیٹھ پر وار
کرتا ہے۔ ہم تم سے اس لئے پوچھتے ہیں کہ تم ہمارے مہمان ہو اور یہ
کافر تمہارا ساتھی ہے۔"

"اگر میں نے اجازت نہ دی تو پھر کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"پھر ہم اسے گولی مار کر تم سے معافی مانگ لیں گے۔" اُس نے
کہا۔ "مسلمان بھائی کا فرض ہے کہ مسلمان بھائی کا قصور معاف کر دے۔"

مجھے پٹھان کے فلسفے پر ہنسی آگئی۔ اُس نے کہا۔ "دیکھو دوست!
ہمیں گناہگار نہ کرو۔ کل شام تک سوچ لو۔ یہ ضرور سوچنا کہ اس
بدصورت اور بزدل ہندو کے بدلے میرے بھانجے کو بہت خوبصورت
اور دلیر لڑکی مل جائے گی۔ ان بڈھوں کا گھر آباد ہو جائے گا۔ کل شام ہم
کو بتا دینا کہ اس ہندو کو گولی مار دو۔ اور پانچ لاشیں پوری کر لو۔"

اُس نے آدم گل کو اندر بلایا۔ رادھے رام بھی اس کے ساتھ
تھا۔ وہ سخت ڈرا ہوا تھا۔ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ مجھے اس پر بہت
ہی ترس آرہا تھا۔ اُس نے ایسے لہجے میں زندگی کی بھیک مانگی کہ میرا
دل غم سے بوجھل ہو گیا۔ کہنے لگا کہ اگر تمہیں میرے بچوں کا خیال نہیں
تو اپنے اللہ کا خیال کرنا۔ تم نے اللہ کی قسم کھائی تھی۔

آدم گل اور اس کا ماموں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ماموں نے مجھے کہا۔
"میں اس کے ساتھ اس کے سُسر کے پاس جا رہا ہوں۔ اسے بتائیں گے
کہ شرط پوری ہو گئی ہے۔ نکاح کا دن مقرر کر لو۔ ہم شاید صبح کے وقت
واپس آئیں گے۔ تم لوگوں کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ آرام سے
سو جاؤ۔ کل تم دونوں کو کھجوری کے قریب چھوڑ آئیں گے۔"

وہ چلے گئے تو بوڑھے نے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہم بھیگے
ہوئے کپڑے اتاریں گے؟ میں نے کچھ سوچ کر سر ہلایا کہ نہیں۔ ہم نے
صرف بوٹ اتارے تھے۔ بوڑھے کے کہنے پر عورت نے کمرے کے
وسط میں مٹی کا چولہا رکھ کر اس میں لکڑیاں جلا دیں اور دیا بجھا دیا۔ بوڑھے

نے ہمیں اشارے سے سو جانے کو کہا۔ وہ اُٹھا اور کمرے سے نکلتے
ہوئے کُتے کو بلایا۔ کُتا اُس کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا اور بوڑھا اندر
آگیا۔ اُس نے دروازہ بند کر دیا اور کواڑوں کے آگے بیس پچیس سیر
وزنی پتھر رکھ دیا۔ کُتا رکھوالی کے لئے باہر نکالا گیا تھا۔ عورت ہم سے
دُور کونے میں لحاف میں منہ سر چھپا کر لیٹ گئی۔ بوڑھا دروازے
کے قریب دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی نرم نرم گھاس پر لیٹا اور اُس نے
بھی لحاف اوڑھ لیا۔

ان لوگوں کو یا تو ہم پر یقین تھا کہ ہم بھاگنے کی کوشش نہیں
کریں گے یا انہیں اپنے خونخوار کُتے پر بھروسہ تھا کہ وہ ہمیں بھاگنے نہیں
دے گا۔ میرے لئے یہ بات بہت افسوسناک تھی کہ میں بھاگنے کی
ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ میری اور خداداد کی زندگی محفوظ تھی لیکن میں رادھے
رام کو بچانا چاہتا تھا کیونکہ میں نے اُس کے ساتھ اللہ کے نام پر وعدہ کیا
تھا۔ میرا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا کہ میں ایک ہندو کی خاطر اپنے مسلمان
بھائیوں کو دھوکا دوں یا نہ دوں۔ آج تیس سال گذر گئے ہیں اور میں ابھی
تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ گناہ تھا یا نیکی۔

میں نے خداداد کو کان میں کہا کہ یہ لوگ سو جائیں تو بھاگنا ضرور ہے۔
اُس نے میری تائید میں سر ہلا دیا اور میرے کان میں کہا کہ باتیں نہ کرو۔
ان لوگوں کو شک ہو جائے گا۔

ہم آگ کے قریب ہو گئے اور گھٹنوں میں سر دے کر اُونگھنے
لگے۔ آگ خوب بھڑک رہی تھی جس سے کچھ وردی خشک ہونے لگی۔ کبھی آنکھ
کھُل جاتی کبھی لگ جاتی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ رات کتنی گذر گئی تھی نہ یہ
معلوم ہو سکا کہ ہم نے بیٹھے بیٹھے کتنا کچھ سو لیا۔ ہمیں بوڑھے اور بڑھیا
کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ لکڑیاں بجھ گئی تھیں اور انگارے
دہک رہے تھے۔ خداداد نے میرے کان میں کہا۔ "میں ٹرائی (آزمائش)
کرتا ہوں۔ ان میں سے کوئی جاگ اُٹھا تو کہوں گا کہ پیشاب کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ دبے پاؤں دروازے تک گیا اور ہاتھ سے پتھر ہٹا دیا۔ پھر اُس نے ایک کواڑ کھولا۔ اتنی خاموش رات میں جہاں سانسوں کی بھی آواز سنائی دے رہی تھی کواڑ کھلنے کی آواز نہ نکلی۔

خداداد باہر نکل گیا۔ وہ شاید دو تین منٹ بعد واپس آیا ہوگا لیکن مجھے یہ دو تین گھنٹوں کا عرصہ لگا۔ خداداد نے مجھے کھلے کواڑ سے اشارے سے بلایا۔ میں نے دیکھا کہ باہر شفّاف چاندنی تھی۔ اُس رات چاندنی زیادہ سفید تھی کیونکہ دن کے وقت بہت زور کی بارش برسی تھی۔ میں نے رادھے رام کے کان میں کہا کہ خداداد کی طرح دبے پاؤں باہر نکل جاؤ۔ سب سے بڑا خطرہ کُتّے کا تھا۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ہمارے میزبان جاگ اُٹھے تو ہم ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیں گے لیکن میں یہ حرکت انتہائی خطرے کی صورت میں کرنا چاہتا تھا۔

رادھے رام باہر نکل گیا۔ بوڑھا اور بڑھیا گہری نیند سو رہے تھے۔ اب میں باہر نکلنے کے لئے اُٹھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنی رائفلیں بھی لیتا چلوں۔ دونوں رائفلیں میرے سامنے تھیں۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کی کھونٹیوں کے ساتھ سلنگوں سے لٹک رہی تھیں۔ ایمونیشن ہمارے پوچوں میں تھا اور پانچ پانچ راؤنڈ میگزینوں میں 'لوڈ' تھے۔ میں دل مضبوط کر کے آگے بڑھا اور کھونٹی سے دونوں رائفلیں اتار لیں۔ میں دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ میں نے خداداد کی رائفل اُسے دے دی۔ ہم تینوں ننگے پاؤں تھے۔ بُوٹ اس لئے بھی نہ پہنے کہ پتھروں پر چلتے آواز پیدا کریں گے۔ ہم نے موٹی جرابیں پہن رکھی تھیں مگر یہ نہ سوچا کہ اتنی ٹھنڈی یخ رات میں ننگے پاؤں پتھروں پر کس طرح چلیں گے۔

"معلوم نہیں کُتّا کہاں ہے؟" — خداداد نے پُوچھا۔

"چلنے کی کرو۔" میں نے کہا "اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کر لو۔ اگر کُتّا سامنے آگیا تو گولی مار دو۔"

مجھے آدم گُل کے ماموں نے باتوں باتوں میں کھجُوری کی سمت

اور راستہ بتا دیا تھا لیکن یہ راستہ کوئی پگڈنڈی یا سڑک نہیں تھی۔ سرحد کے پہاڑی علاقے میں کسی راستے کا یوں زبانی پتہ نہیں چلا کرتا۔ مجھے صرف سمت یاد تھی اور یہ بھی یاد تھا کہ مکان کے عقب میں دو پہاڑیوں کے درمیان تنگ گلی ہے۔ یہ دُور اُوپر لے جاتی ہے۔ چنانچہ ہم تینوں مکان کے عقب میں چلے گئے۔ دل دھڑک نہیں رہے تھے بلکہ اُچھل رہے تھے۔ مکان کے پیچھے تھوڑی دُور آسمان سے باتیں کرتے پہاڑ نظر آ رہے تھے اور ان کے درمیان تنگ گلی تھی۔ ہم اس میں داخل ہو گئے اور بہت تیز چلنے لگے۔ مارچ کی رات کو بادلوں اور بارش نے برف کی طرح ٹھنڈا کر دیا تھا۔ ٹھنڈے یخ پتھر پاؤں کو کھا رہے تھے۔ آگے خداداد، پیچھے میں۔ ہم نے رادھے رام کو درمیان میں رکھا تھا۔ اسی کم بخت کی خاطر ہم اپنے آپ کو اِس مصیبت میں ڈال رہے تھے۔

ہم گلی میں بہت دُور تک چلتے چلے گئے۔ گلی کئی موڑ مُڑی تھی۔ آگے دیکھا کہ ایک اور پہاڑی کھڑی ہے اور گلی بند۔ ہمارے دم خشک ہو گئے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم کوئی ایک میل چلے ہوں گے۔ اب ہم اتنا فاصلہ واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ خداداد نے کہا کہ پیچھے چلو، ہم شاید کوئی موڑ مُڑتے اصلی گلی کو پیچھے چھوڑ آتے ہیں لیکن میں نہ مانا۔ مجھے اب چاند اور قطبی ستارے کو دیکھ کر سمت کا یقین ہو گیا تھا۔ خداداد نے پھر پیچھے چلنے کی ضد کی۔ میں شاید مان جاتا لیکن دُور سے کُتّے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ بوڑھا بیدار ہو گیا ہے اور کُتّا ہمارے تعاقب میں ہے۔ مجھے خطرے کا احساس اُس وقت ہُوا جب یاد آیا کہ کُتّے نے ہم تینوں کی بُو سونگھی تھی اور اسے تعاقب میں کوئی دِقّت نہیں ہوگی۔

میں نے اُوپر دیکھا تو ہر طرف خوفناک پہاڑ کھڑے دکھائی دیتے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ کا نام لو اور اُوپر چڑھو۔ خداداد تو ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا لیکن رادھے رام اس طرح باتیں کر رہا تھا

جیسے وہ صاحب بہادر ہے اور شکار کھیلنے آیا ہے اور ہم اس کا سامان اٹھائے ہوئے قلی ہیں۔ کہنے لگا ــــ "نہ استاج، موہ سے تو نہ چڑھا جا۔ کوئی ہور راستہ کھوج لو"ــــ میں نے اُسے جو جواب دیا وہ لکھا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ کہانی مائیں بہنیں بھی پڑھیں گی۔

ہم بے حد دشوار اور خطرناک پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ ہر بار پاؤں پھسلتا تھا اور ہم جھک کر ہاتھوں کا سہارا لیتے تھے۔ ہم سیدھے اُوپر نہیں بلکہ پہاڑ کے پہلو سے اُوپر چڑھ رہے تھے۔ پھر ہم پہاڑ کے وسط تک جا پہنچے۔ اتنی بلندی کہ نہ زمین پر نہ آسمان پر، اب ہم جانوروں کی طرح ہاتھوں اور پاؤں کے بل اُوپر چڑھ رہے تھے۔ ہم ایک ایک اِنچ آگے سرکتے تھے اور ہر لمحہ یہ خطرہ کہ ابھی گرے اور نیچے اندھیری تہہ میں جا ہڈی پسلی ٹوٹی۔ سردی سے ہاتھوں کی انگلیاں اکڑ گئی تھیں۔ خداداد بہت اُوپر چڑھ گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُوپر سے اس کی آواز سنائی دی ــــ "جمال گرائیں، میں سلنگ لٹکاتا ہوں۔ اسے پکڑ کر اُوپر آجاؤ"ــــ اُس نے رائفل کے سلنگ کا ایک سرا رائفل کے ساتھ باندھ رکھا تھا اور دوسرا سرا نیچے لٹکا دیا۔ یہی گز ڈیڑھ گز کا فاصلہ بہت خطرناک تھا۔ معلوم نہیں خداداد کس طرح چڑھ گیا تھا۔ میں نے رادھے رام سے کہا کہ ہمت کرو۔ دو چار ہاتھ اور اوپر سِرکو اور سلنگ کو پکڑ کر اُوپر چلے جاؤ۔ وہ میرے آگے تھا۔

وہ کم بخت یوں اُوپر اُٹھا جیسے میدان میں کھڑا ہو۔ سلنگ تو ابھی دُور تھا۔ رادھے کے دونوں پاؤں پھسل گئے اور وہ منہ کے بل گرا۔ اگر وہ پیچھے کو گرتا تو اُس کا معاملہ صاف تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار واویلا نکلا ــــ "اُستاج پکڑ لیتو"ــــ اُوپر سے خداداد کی آواز آئی ــــ "کیوں جمال، کہ اڑ گیا؟"ــــ میں نے کہا "نہیں ابھی ہے۔" رادھے رام لڑھکا۔ میں اُس کے نیچے تھا۔ وہ پتھر کی طرح لڑھکتا مجھ سے ٹکرایا۔ میں نے جس طرح اپنے ہاتھ اور پاؤں پہاڑ کے ساتھ جما

کر جسم کو نیچے جانے سے روکا، میں بیان نہیں کرسکتا۔ یہ کوئی خدائی مدد تھی۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں ہندو سے کہا کہ اُوپر کو سِرکو۔ وہ اُوپر کو کیا سِرکا کہ مجھے پتھر سمجھ کر سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔ مجھ سے تو اب بولا بھی نہیں جاتا تھا۔

بڑی مشکل سے اُسے کچھ سمجھ آئی تو اس نے آگے کو زور دیا کچھ میں نے اسے دبایا اور وہ آگے بڑھا لیکن میں اور زیادہ نیچے سرک گیا۔ میں نے رادھے رام کو یہیں پہاڑ کے ساتھ چپکے رہنے کو کہا اور خود اُس کے بائیں پہلو سے ہاتھوں اور پاؤں کو مضبوطی سے پتھروں میں جما کر اوپر رینگنے لگا۔ میرے جسم میں جو تھوڑی سی طاقت رہ گئی تھی، وہ رادھے رام کی ٹکر اور بوجھ نے ختم کر دی تھی۔ اب تو مجھے خدا کا ہاتھ اُوپر سرکا رہا تھا ورنہ میں کئی سَو فٹ نیچے گرتا اور انجام ظاہر تھا۔

میں اتنا اوپر چلا گیا کہ خداداد کا سلنگ ہاتھ میں آگیا۔ یہ عمودی پتھر تھا۔ میں نے خداداد کو پکار کر خبردار کیا اور سلنگ کو پکڑ کر اُوپر چلا گیا۔ خداداد ذرا گہرائی میں اپنے آپ کو جمائے ہوئے تھا۔ ہم دونوں رادھے رام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس نے پھر دھاڑیں مارنی شروع کر دیں۔ اور کہنے لگا "رے اُستاج، رے کھداداد، بھاگ نہ جائیو۔"

میں نے اپنی رائفل سے بھی سلنگ کھول لیا جس کا ایک سرا خداداد کے سلنگ کے سرے سے باندھ کر رائفل نیچے لٹکا دی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہندو اتنا ہوشیار نہیں کہ صرف سلنگ کی مدد سے اُوپر آسکے۔ اُس نے رائفل کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا اور ہم نے اسے اُوپر گھسیٹ لیا۔ اب جسم کا یہ حال تھا کہ اُٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر برف سے جمی ہوئی ہوا جسموں سے پار ہو رہی تھی۔ ہاتھ اکڑ گئے تھے۔ جرابیں پھٹ گئی تھیں اور پاؤں بے جان ہو گئے تھے۔ ایک قدم چلنے کی ہمت نہیں تھی لیکن ہمیں چلنا نہیں بھاگنا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی کھلا میدان تھا جس پر جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر اور بڑی سلیں اُبھری ہوئی تھیں۔ چاندنی میں اُن کی شکلوں سے

ڈر آتا تھا۔ میں نے سمت کا اندازہ کیا اور چل پڑے مگر پاؤں اس طرح کٹ رہے تھے جیسے ہم کانچ کے ٹکڑوں پر چل رہے ہوں۔ چلنے کی رفتار چیونٹی سے زیادہ نہیں تھی۔

ہمیں ایک بار پھر خاموش اور ڈراؤنی رات میں دُور نیچے کُتّے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ آواز بہت دُور نیچے سے آتی تھی — رات اتنی خاموش تھی کہ کنکری لڑھکتی تو ایسے آواز آتی تھی جیسے مشین گن فائر ہو رہی ہو۔ کُتّے کی آواز نے ہمیں یقین دلا دیا کہ وہ درندہ ہمارے تعاقب میں ہے۔ ہم تیزی سے چلنے لگے اور اسی تیزی سے ہمارے پاؤں کٹنے لگے۔

کچھ یاد نہیں کہ ہم کتنی دیر چلے اور کتنا فاصلہ طے کیا۔ اتنا ضرور محسوس کیا کہ ہم آہستہ آہستہ نیچے اُتر رہے ہیں۔ یہ اس پہاڑی کی ڈھلان تھی۔ ہم چلتے گئے اور بہت نیچے پہنچ گئے۔ سامنے پہاڑیوں کا ایک سلسلہ اور کھڑا تھا۔

آخر خداداد جیسا دلیر اور بہادر جوان بیٹھ گیا۔ ہاری ہوئی آواز میں بولا — "جمال، پاؤں چلنے نہیں دیتے۔" میرا حال اس سے بھی بُرا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ پاؤں دیکھے تو تینوں کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ خداداد نے چونک کر کہا "جمال بھائی — مشکل حل ہو گئی" — اُس نے اپنے جھولے سے پگڑی نکالی تو مجھے یاد آیا کہ ہم نے پگڑیاں بھیگ جانے کی وجہ سے جھولوں میں ڈال لی تھیں۔ ہم نے پگڑیوں کو درمیان سے پھاڑا اور پاؤں پر لپیٹ لیا۔ جب اُٹھ کر چلے تو بہت سہولت محسوس ہوئی۔ سردی سے جو دانت بج رہے تھے اس کا کوئی علاج نہ تھا۔

اب ہم ایک کشادہ سی وادی میں چل رہے تھے جو چھوٹے چھوٹے پتھروں سے اٹی ہوئی تھی۔ ایک پہاڑی کے دامن میں ہمیں ایک کھوہ نظر آئی۔ قریب جا کے دیکھا تو ایک کشادہ غار تھا۔ میں نے سوچا کہ ذرا سردی سے بچ کر ستا لیں اور جسموں کو گرم کر لیں۔ ہم تینوں غار کے اندر جا کر ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئے۔ مصیبت یہ آئی کہ ہم بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ یہ بہت

خطرناک غلطی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو میں گھبرا کر اُٹھا۔ غار سے باہر وادی صبح کی روشنی سے چمک رہی تھی۔ میرے دونوں ساتھی غار کی دیوار کے ساتھ گہری نیند سوتے ہوتے تھے۔ میں نے اُنہیں جگایا اور بتایا کہ دن نکل آیا ہے، اُٹھو اور بھاگو۔ ہم گھبراہٹ میں باہر کو بھاگے۔ جونہی غار سے نکل کر ایک طرف چلے تو قریب ہی کہیں کُتّا بھونکا اور بڑی خوفناک آواز میں غرایا۔ رادھے رام ہم سے پیچھے تھا۔ میں نے تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا، میرا دل ڈوب گیا۔ لوڑھے کا خونخوار کُتّا اچھل کر رادھے رام پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کُتّے کے پنجے رادھے کے پہلوؤں میں تھے اور کُتّا اس کی پیٹھ میں دانت گاڑھ رہا تھا۔ رادھے رام کی چیخیں پہاڑوں کو ہلا رہی تھیں۔ میں نے چھلانگ لگائی اور رائفل کا بٹ لاٹھی کی طرح کُتّے کے سر پر مارا۔ کُتّا چکرا کر دُور جا گرا اور اُٹھ کر پیچھے کو بھاگا۔ وہ بُری طرح چیخ اور بھونک رہا تھا۔ وہ رُک گیا اور اب کے زیادہ خونخوار طریقے سے ہماری طرف دوڑا۔ خداداد نے رائفل سیدھی کی۔ فائر کرکے پہلی ہی گولی میں کُتّے کو اُلٹا دیا۔ کُتّا دو لڑھکنیاں کھا کر پھر اُٹھا لیکن ذرا سا کانپا اور گر پڑا۔

خاموش وادی میں رائفل کی گولی کی آواز توپ کے دھماکے کی طرح سنائی دی۔ ہم اپنی منزل کی سمت بھاگے اور اس کشادہ وادی میں سے نکل کر پھر چٹانوں کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے۔ ہم تینوں ایک ٹیکری پر جا چڑھے اور دو کھڑی سلوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے اس اوٹ میں سے چاروں طرف دیکھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا اور دُور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن کُتّا ہماری بُو پا کر یقیناً اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے پیچھے آدمیوں کا ہونا لازمی تھا۔

ہم تینوں اُٹھ کر تیزی سے نیچے اُترنے لگے۔ اچانک وادی میں رائفل کے دو دھماکے گرجے اور فضا لرزنے لگی۔ رادھے رام میرے پیچھے تھا۔ اُس کی سِسکی سی سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ مجھے بُت

کی طرح کھڑا نظر آیا۔ اُس کے دائیں کندھے اور گردن کے درمیان سے خون اُبل کر باہر آ رہا تھا۔ رادھے رام کے گھٹنے دوہرے ہونے لگے اور وہ پہلو کے بل گر کر پیٹھ کے بل ہو گیا اور بے حس ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ بڑا کڑیل جوان تھا۔ جسم سے خون کھلے ہوتے نلکے کی طرح بہہ رہا تھا۔ میں رُک گیا۔ پٹھانوں نے ہمیں یقیناً دیکھ لیا تھا۔ اب میں دو اور گولیوں کا انتظار کرنے لگا جنہیں میرے اور خداداد کے جسموں سے پار ہونا تھا۔

ایک آدھ منٹ گذر جانے تک کوئی گولی نہ آئی تو میں نے اپنی رائفل کو سر سے اُوپر کر کے دُور اپنے سامنے پھینک دیا۔ میرے کہنے پر خداداد نے بھی رائفل پھینک دی۔ جس ہندو کو ہم بچانا چاہتے تھے وہ مر چکا تھا۔ اب ہم اپنے پٹھان بھائیوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے۔

دُور، سامنے کی ٹیکری سے آدم گل اور اس کا ماموں ہماری طرف دوڑے آ رہے تھے۔ خداداد نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کریں گے؟ میرا دل دُکھ اور شکست سے بوجھل ہو گیا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ اب جو کچھ ہوگا ہونا رہے۔ اللہ مالک ہے۔ میں ان لوگوں سے لڑوں گا نہیں۔

آدم گل اور اُس کا ماموں ہمارے سامنے آ رُکے۔ میری زبان بند تھی۔ ہاتھ اُوپر تھے۔ آدم گل کے ماموں نے کہا ــــ "بدبختو! ہاتھ نیچے کرو۔ تم نے ہمیں دھوکا دیا۔ تم مسلمان ہو یا کافر ہو؟"

میں نے جواب دینے سے پہلے رادھے رام کی لاش کو دیکھا۔ وہ پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ لاش کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرہ درد سے کھچا ہوا تھا۔ مجھے بہت ہی دُکھ ہُوا۔ میں نے پٹھان سے کہا ــــ "تم نے اپنا شکار مار لیا ہے۔ میں تمہارا چور ہوں۔ تمہارے شکار کو بھگا کر لے جا رہا تھا۔ اب مجھے گولی مار سکتے ہو۔ میں نے اس کے ساتھ اللہ کے نام پر وعدہ کیا تھا کہ اس کی جان بچاؤں گا۔ میں ہار گیا ہوں خان!"

"نہیں تم جیت گئے ہو" اُس نے کہا "مسلمان کو زبان کا پکا ہونا چاہیئے۔ ہمیں اس کی لاش کی ضرورت تھی اس لئے اسی کو گولی ماری۔

تم جاؤ، تم نے میرے بہنوئی اور میرے بھانجے کے ساتھ ایک رکابی میں کھانا کھایا ہے اور اُن کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔"

"ہم نے تمہارے کُتے کو مار دیا ہے" میں نے کہا۔ "اس کے بدلے ہماری دونوں رائفلیں اور ایمونیشن لے لو۔ مجھ پر جو آئے گی بُھگت لوں گا" ــــ بات کرتے آنسو نکل آئے۔

"رائفلیں اُٹھالو" اُس نے کہا "یہ ہم پر حرام ہیں۔ تمہیں کھجوری کا راستہ معلوم ہے؟"

"نہیں"۔

"میرے ساتھ چلو" اور اُس نے آدم گل سے کچھ کہا تو آدم گل نے دو زانو بیٹھ کر رادھے رام کی لاش کو کندھے پر ڈالا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کا ماموں ہمارے ساتھ ہو لیا۔

ہم نے اپنی رائفلیں اُٹھالی تھیں۔ میں نے اسے کہا کہ ہمارا ایمونیشن لے لو۔ اس کے متعلق تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فائر کر آتے ہیں لیکن اُس مردِ مجاہد نے ایمونیشن بھی نہ لیا۔ وہ ہمیں سیدھے راستے پر لے کے چلا اور کوئی ایک گھنٹہ بعد بڑی سڑک آگئی جس کے دوسری طرف کھجوری کا قلعہ کھڑا تھا۔ ایک نشیبی جگہ میں کھڑے ہو کر وہ ہم دونوں سے بغلگیر ہُوا اور کہنے لگا "تم دونوں مرد کے بچے ہو۔ تمہاری مدد پٹھان کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا" اور وہ چلا گیا۔

ہم دونوں کھجوری قلعے میں داخل ہوتے تو ہماری کمپنی کے سپاہی ہمیں اس طرح حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے جیسے ہم زندہ نہیں بلکہ بد روحیں ہوں۔ کمپنی صوبیدار ہمیں کمپنی کمانڈر میجر راجرز کے پاس لے گیا۔ ہماری حالت بہت بُری تھی پاؤں کھولے تو سُوجے ہوتے تھے اور جگہ جگہ سے زخمی۔ کمپنی کمانڈر نے کہا ــــ "ٹھیک ٹھیک بیان دو" ــــ میں نے اُسے ساری بات سُنادی۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔ یہ بھی سُنا دیا کہ میں نے پٹھانوں سے کہا تھا کہ ہماری رائفلیں لے لو۔

میجر راجرز کوئی خاندانی انگریز تھا۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے ایک جھوٹی رپورٹ لکھی اور اس پر میرے دستخط کرا لئے۔ اُس کے مطابق مجھ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس رپورٹ میں ہماری قید اور فرار کا کوئی ذکر نہ تھا۔ میجر راجرز نے مجھے کہا "تم بہادر جوان۔ شاباش۔ تم ٹھیک بولا۔ سچ بولا۔ شاباش۔"

مجھے پتہ چل گیا کہ میری پارٹی کا کوئی سپاہی زندہ نہیں بچا۔ خچر، مشین گن اور تمام ہتھیار لاپتہ ہیں۔ میں نے کمپنی کمانڈر سے کہا—
"صاحب بہادر۔ میں نے آپ کا بہت نقصان کیا ہے۔"

"فکر نہیں جوان" اُس نے کہا "تم بہادر۔ تم قیمت والا جوان۔ سامان اور خچر نہیں قیمت والا۔ ہم بہادر جوان مانگتا، خچر نہیں مانگتا۔"

پھر میں اور خداداد چودہ دن ہسپتال میں پڑے رہے۔

اس واقعہ کو آج تیس سال گذر گئے ہیں۔ مجھے پٹھانوں نے معاف کر دیا تھا۔ پھر مجھے انگریز نے بھی معاف کر دیا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مجھے خدا نے بھی معاف کیا ہے یا نہیں۔ میں نے اسی کے نام پر ایک ہندو کو موت کے منہ سے نکال لینے کی کوشش کی تھی لیکن گناہ یہ کیا کہ جن کے ساتھ ایک رکابی میں کھانا کھایا اور جن کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور جنہوں نے مجھے بھائی بنا لیا تھا، میں نے اُنہیں دھوکہ دیا۔

یہ واقعہ میرے دل میں کانٹے کی طرح چُبھتا رہتا ہے۔ آج پہلی بار سب کو سُنا رہا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ، میں گناہگار تو نہیں؟

ضمیر کا کانٹا

راوی: چچا ماجد
تحریر: اختر حسین

چچا ماجد کی آواز میں خدا نے وہ سوز پیدا کیا ہے جو راہ گیروں کو روک لیتا اور جذبات میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ وہ ہیر وارث شاہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں گاتا۔ اس کے گانے کا کوئی وقت بھی نہیں۔ کبھی آدھی رات کے بعد اُس کی آواز چاند تاروں پہ وجد طاری کرنے لگتی ہے اور کبھی دن کے کسی بھی وقت اُس کی آواز کا طلسماتی ترنم سارے گاؤں کو دم بخود کر دیتا ہے۔ اِدھر اُدھر کوئی ہزار منتیں کرے کہ چچا وارث شاہ کے دو بول سنا دو تو وہ جواب میں صرف مسکرا دیتا ہے، سناتا کچھ بھی نہیں۔ البتہ مہمانوں کے نام پہ کی ہوئی فرمائش کو نہیں ٹالتا۔ صرف اتنا کہہ دو کہ چچا، میرے مہمان ہیر سُننے آئے ہیں تو وہ مہمانوں کو مایوس نہیں کرتا۔

میں اتفاق سے اس کے گاؤں میں مہمان ٹھہرا اور اس کی آواز کے جادو نے مجھے اس کا مرید بنا لیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کی آواز میں صرف سوز ہے مگر اس کے قریب گیا تو پتہ چلا کہ اس سوز میں ایک پُراسرار کہانی بھی ہے۔ اُس کے ساتھ ملاقات کا اتفاق اس طرح ہوا کہ میں ایک پیر کا مرید تھا۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اَن پڑھ دیہاتی ہوں۔ میں بی۔ اے کی ڈگری نہیں لے سکا کیونکہ گھر کے حالات نے تھرڈ ایئر میں ہی نوکری کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ والد صاحب نے مجھے بچپن سے ہی اس پیر کی کرامات سنانی شروع کر دی تھیں۔ جن سے میں بہت ہی متاثر ہوا۔ میرا سارا خاندان

اس پیر کا مرید ہے۔ چچا ماجد سے ملاقات کے بعد میں نے مُریدی سے توبہ کر لی ہے۔ پیر کی گدّی میرے گاؤں سے دُور تھی۔ میں سال میں دو بار وہاں جایا کرتا تھا۔ ایک بار صرف سلام کرنے اور دوسری بار اس پیر کے باپ کے سالانہ عرس پر۔ لوگوں کی طرح میں بھی یقین رکھتا تھا کہ اس پیر کے قبضے میں جنّات ہیں۔ اگر کسی پر جن کا قبضہ ہو جاتا ہے تو یہ پیر جن کو حاضر کر کے سزا دیتا ہے۔ ایسی بہت سی کہانیاں تھیں جنہیں میں سچ مانا کرتا تھا۔

اس سال عُرس پر گیا تو وہاں اپنے محکمے کے ایک ساتھی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے اپنے گاؤں لے گیا۔ عُرس پر قوالوں کی تین پارٹیاں آئی ہوئی تھیں۔ میں قوالیوں کا دلدادہ ہوں۔ اپنے ساتھی کے ساتھ میں ایک قوال کا ذکر کر رہا تھا جس کی آواز مجھے بہت پسند آئی تھی۔ اُس نے کہا ـــ "اگر تم آواز سُننا چاہتے ہو تو میں تمہیں سنواؤں گا"۔ ـــ اس نے اپنے گاؤں کے چچا ماجد کا ذکر کیا اور اُس کے متعلق کچھ اور باتیں بھی بتائیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ چچا ماجد سے اس پیر کے مُرید بہت اصرار کر چکے ہیں کہ کبھی عُرس پر ان کے ساتھ چلے اور وہاں ہیر سنائے مگر وہ نہیں مانا۔ وہ پیروں کو نہیں مانتا۔ اپنے ساتھی کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ چچا ماجد کوئی پُراسرار شخصیت ہے۔

رات کو میں چچا ماجد کے گھر اپنے میزبان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بوڑھا آدمی ہے۔ اس کا کُنبہ دو افراد پر مشتمل ہے۔ وہ اور اس کی بیوی۔ غریب سے لوگ ہیں لیکن مطمئن اور خوش۔ چچا ماجد نے مجھے مہمان سمجھ کر ہیر وارث شاہ سنانی شروع کر دی۔ ایک تو وارث شاہ کے الفاظ، ان کے ساتھ چچا ماجد کی آواز۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی آواز میں سارنگی اور بنسری کی سنگت بھی شامل ہے۔ آواز صرف سریلی نہیں پُرسوز بھی تھی۔ اس نے ابھی ایک بند بھی پورا نہیں کیا تھا کہ ایک ایک کر کے گاؤں کے کئی آدمی آ گئے اور زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر جو بھی آتا تھا زمین پر بیٹھ جاتا تھا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بھی چچا ماجد کے برابر بیٹھنے کی گستاخی نہیں کرنا چاہتا۔

میں وہاں سے اپنے اندر ایسا تاثر لے کے نکلا جو آج بھی میرے اندر تازہ ہے۔ میرے ساتھی نے اُس کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں انہیں میں نظر انداز نہیں کر سکا۔ میں نے اس کی تصدیق چچا ماجد سے کرانے کی ٹھان لی اور پندرہ سولہ روز بعد میں ایک بار پھر چچا ماجد کے گاؤں چلا گیا۔ اُس کے لئے دو تحفے بھی لیتا گیا جو اُس کی بوڑھی بیوی کو بہت پسند آئے۔ میں دن بھر اُن کے گھر رہا۔ چند دنوں بعد پھر گیا۔ بُوڑھوں کا یہ جوڑا پیار کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ تیسری ملاقات میں چچا ماجد نے مجھے اپنے بیٹے کا درجہ دے دیا۔ اُس کا اپنا کوئی بیٹا نہیں، نہ بیٹی ہے۔ میں نے ان ملاقاتوں میں اپنے ساتھی کی سناتی ہوئی باتوں کی تصدیق چچا ماجد سے کرالی تھی۔ بعض باتوں کی اس نے تردید بھی کی۔ چوتھی ملاقات میں اس نے اپنی زندگی کی کہانی مکمل کر دی جو میں اُسی کی زبان میں آپ کو سُنا دیتا ہوں۔

"میں مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں میں کمین ذات کے باپ کے گھر پیدا ہُوا تھا۔ ہوش سنبھالا تو باپ کو اُونچی ذاتوں کے گھروں میں کام کرتے دیکھا۔ اس کے عوض ہمیں دانے اور عیدوں پر پیسے اور کپڑے ملتے تھے۔ میں نے بچپن ہی میں باپ کی طرح اُن لوگوں کی مُٹھی چاپی شروع کر دی تھی جنہیں خدا نے اُونچی ذاتیں دی تھیں۔ میرا دل اس اُونچ نیچ کو قبول نہیں کرتا تھا۔ گرمی ہو یا سردی مجھے کبھی جُوتی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ میری ہی عمر کے لڑکے بڑی اچھی اچھی جوتیاں پہنتے تھے۔ دس سال کی عمر تک میرا لباس صرف ایک کُرتہ رہا۔ شلوار یا چادر صرف عیدوں پہ پہننے کو ملتی تھی۔ میرا باپ اگر کبھی بیمار بھی ہوتا تو اُسے چوہدریوں کے گھر سے جب بھی بلاوا آتے جانا پڑتا تھا۔ وہ نہ جا سکتے تو میری ماں جاتی اور وہ کام چاہے مردانہ ہی کیوں نہ ہو میری ماں کر آتی تھی۔ جُوں جُوں میں بڑا ہوتا گیا میرے دل میں یہ احساس پکا ہوتا گیا کہ میں بھی انہی جیسا انسان ہوں جنہوں نے مجھے اور میرے باپ کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ مجھ میں یہ احساس کیوں پیدا ہُوا تھا۔ میں نے ایسی بات کہیں پڑھی نہیں تھی کیونکہ میں اَن پڑھ تھا۔ ماں اور

باپ نے بھی مجھے ایسی بات کبھی نہیں بتائی تھی، نہ اُنہوں نے کبھی اپنی قسمت
کا گلہ کیا تھا۔ وہ تو اسی ذلیل زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔ اُن کے ماں باپ
نے بھی گاؤں میں انہی کی طرح کتوں اور مویشیوں کی سی زندگی گزاری تھی....
"میں بغاوت نہیں کر سکا کیونکہ اتنی جرأت نہیں تھی۔ دل ضرور باغی تھا۔
خدا نے مجھے آواز سریلی دے دی اور گانے کا شوق بھی دے دیا۔ ہمارے
علاقے میں ایک اندھا ہیر وارث شاہ گا کر سُنایا کرتا تھا۔ اُس کی آواز نے
اور وارث شاہ کے شعروں نے مجھ پر جادو کر دیا۔ میں نے اُس سے سُن کر دو چار
بَیت زبانی یاد کر لئے ہیں کھیتوں میں جا کر ہیر گاتا رہتا۔ مجھے اپنی آواز بہت اچھی
لگتی تھی۔ ایک روز میں اُس حافظ کے پاس جا بیٹھا اور اُسے اپنا شوق بتایا۔ اس
نے مجھ سے ایک بیت سُنا تو مجھے گلے لگا لیا۔ وہ میرا اُستاد بن گیا۔ آج مجھے
جتنی بھی ہیر یاد ہے وہ اُسی نے یاد کرائی تھی۔ میرے گاؤں والے مجھ سے
سرِ رات ہیر سُنا کرتے تھے۔ اس سے مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔ میں سمجھتا
تھا کہ اس وصف نے مجھے گاؤں والوں سے زیادہ درجہ اگر نہیں دیا تو اُن کے
دلوں میں میری عزت تو ضرور ہی پیدا کر دی ہے، مگر یہ میرا وہم تھا۔ اُونچی
ذاتوں نے مجھ پر ظاہر کر دیا کہ میری آواز بھی اُن کی غلام ہے۔ کبھی کبھی کسی
چوہدری کے گھر مہمان آتے تو وہ مجھے بلا کر فرش پر بٹھا دیتے اور کہتے — 'اوے،
سُنا انہیں ہیر' — میں سُنا دیتا اور حکم ملتا — 'جا بھاگ جا' — اور میں
وہاں سے چلا آتا....

"یہ میری عادت ہو گئی ہے کہ کسی کے حکم سے گانے کو جی نہیں چاہتا،
صاف انکار کر دیتا ہوں۔ ہمارے گاؤں سے تین چار میل دُور ایک پیر کی گدی
تھی اور مشہور مزار بھی تھا۔ اس کی مُریدی دُور دُور تک تھی۔ کہتے تھے کہ اس
گدی کے مُرید جنات بھی ہیں جو وہاں سلام کرنے آتے ہیں۔ میں اُس پیر کا
نام نہیں بتاؤں گا ورنہ اس کے مُرید یہاں بھی ہوں گے۔ کوئی مجھے جان سے
مار دے گا۔ پیر اُدھیڑ عمر تھا۔ اس کا ایک بیٹا جوان تھا جو اُس کی پہلی بیوی
سے تھا۔ وہ مر گئی تھی۔ پیر کی اب دو بیویاں تھیں۔ ایک کی عمر تیس ایک سال

ہو گی۔ دوسری چھوٹی تھی۔ اس کی عمر اس کے بیٹے جتنی تھی۔ ایک روز میرا اُستاد
حافظ مجھے اُس پیر کے پاس لے گیا۔ کہتا تھا کہ سرکار ہیر وارث شاہ اور سُریلی
آواز کے شیدائی ہیں۔ اُس وقت میری عمر سولہ سترہ سال ہو گئی تھی۔ میں حافظ
کے ساتھ چلا گیا۔ پیر کو ہیر سُنائی تو اُس نے حافظ سے کہا — 'حافظا! یہ لڑکا تیرا
نام ڈبو دے گا' — حافظ نے کہا — 'اللہ کی دین ہے سرکار! میں تو سرکار
کا دل خوش کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے اپنی سی اچھی آواز سرکار کے حضور
پیش کر دی ہے'....

"پیر نے مجھے اپنی مُریدی میں لے لیا اور میں ہر جمعرات کی شام
اُس کے دربار میں حاضری دینے لگا۔ جمعرات کی شام وہاں میلے کا سماں ہوتا
تھا۔ مرد اور عورتیں مزار پر دیئے جلانے اور پیر کو سلام کرنے آتے تھے۔
ان میں جوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ آج کل لوگ فلمی گانوں اور بناوٹی آوازوں
پر مرتے ہیں۔ وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ لوگ ہیر وارث شاہ، یوسف زلیخا اور
سیف الملوک سنانے والوں کے پیچھے لمبے لمبے سفر طے کرتے تھے۔ رات کے
وقت کسی گانے والے کی آواز جہاں جہاں تک پہنچتی تھی وہاں سنّاٹا طاری
ہو جاتا تھا۔ لوگ سُریلی آواز کی قدر کرتے تھے۔ عورتیں چونکہ جذباتی ہوتی ہیں
اس لئے وہ جذباتی الفاظ اور سُریلی آواز کی زیادہ شیدائی تھیں۔ تم نے دیکھا
ہو گا کہ فلمی گانا کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لوگ تھوڑی مُدت سُنتے اور گاتے ہیں پھر
اسے بھول جاتے ہیں لیکن ہیر وارث شاہ جو ایک ہی طرز اور سُر میں گائی جاتی
ہے میرے دادا پر دادا کے وقتوں سے لے کر آج تک سُنی اور گائی جاتی
ہے اور اس کے شوقین ابھی تک اس سے اُکتائے نہیں....

"وہ زمانہ مردانگی کا تھا۔ لوگ اچھے لباس کی بجائے اچھے جسم کی قدر کرتے تھے۔
لوگ قیمتی کپڑوں کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ یہ دیکھتے تھے کہ ان کپڑوں کے اندر جسم کیسا
ہے۔ کُشتی اور کبڈی کے اکھاڑے ہر گاؤں میں تھے۔ کسی گاؤں کا پہلوان یا
کبڈی کے کھلاڑی ہار جاتے تو سارے گاؤں کی ناک کٹ جاتی تھی۔ ہمارے
گاؤں میں کبڈی کے بارہ کھلاڑی تھے۔ اُن کے جسم دیکھنے کے قابل تھے۔ یہ جسم

مجھے اتنے اچھے لگتے تھے کہ میں نے بھی جسم بنانا شروع کر دیا۔ میں نے جس طرح ہیر وارث شاہ گانے میں نام پیدا کر لیا تھا اسی طرح میں جب کبڈی کے اکھاڑے میں اُترا تو پرانے کھلاڑیوں نے مجھے بتایا کہ میں بہت اچھا کھلاڑی بن سکتا ہوں .... یہ میرا شوق تھا جس نے چھ مہینوں کی ورزش اور مشق سے مجھے گاؤں کی عزّت گاؤں میں رکھنے کے قابل بنا دیا۔ استادوں نے داؤ سکھا دیئے۔ بڑے چوہدری نے میرے لئے ایک سیر دُودھ روزانہ لگا دیا۔ اسی برادری کے ایک گھر نے میرے لئے خالص گھی اپنے ذمے لے لیا۔ اتنی اچھی اور خالص غذا نے میرے جسم کو خوبصورت بنا دیا۔ طاقت بے حساب آگئی ....

"میں اپنے کھلاڑیوں کے ساتھ تین چار گاؤں میں کبڈی کھیلنے گیا۔ ہم ہر جگہ سے جیت کر آتے۔ ایک گاؤں کے ساتھ ہماری بڑی لمبی ٹکر ہوگئی۔ اُس کے کھلاڑی علاقے میں دُور دُور تک مشہور تھے۔ صرف ہمارے گاؤں یعنی ہم نے اُنہیں نیچا دکھایا تھا۔ مزار کے عُرس پر کبڈی کھیلی جاتی تھی۔ سارے مذہبوں کے لوگ دیکھنے آتے تھے۔ مُریدوں کا ہجوم بھی ہوتا تھا۔ تین عُرسوں پر ہم نے اس گاؤں کے کھلاڑیوں کو خوب مار دی تھی۔ اُن کے گاؤں میں جا کر بھی ہم اُنہیں مار آتے تھے۔ مقابلہ بڑا سخت ہوتا تھا۔ ہار جیت میں اُنیس بیس کا فرق رہ جاتا تھا۔ اُن کے گاؤں میں ہم جب بھی گئے اُنہوں نے کبڈی کے بعد ہماری بہت ہی خاطر تواضع کی اور ہر بار اُنہوں نے مجھ سے ہیر وارث شاہ سُنی۔ وہ گاؤں ہمارے پیر کے گاؤں کے قریب تھا۔ ہمارے گاؤں سے ساڑھے تین میل دُور تھا۔ مجھے اپنی آواز، جسم کی خوبصورتی اور کبڈی کی مہارت سے بہت شہرت حاصل ہوگئی، مگر میں رہا کمین ذات ہی۔ کئی بار میرے کانوں میں یہ الفاظ پڑے ــــ 'ہے تو کمین ذات لیکن خدا نے گُن بڑے اُونچے دیئے ہیں' ــــ گاؤں میں میری عزت تھی لیکن میں کسی کی برابری میں چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھ سے خدمت کرائی جاتی اور بیگار لی جاتی تھی ....

"میں جب اپنی اس حیثیت پر نظر ڈالتا تو دل کو رنج ہوتا تھا۔ میں نے گاؤں سے باہر باہر رہنا شروع کر دیا۔ زیادہ وقت پیر کی بیٹھک میں گزرتا تھا۔ پیر مجھ پر مہربان تھا۔ وہاں میرا دوستانہ ایسے آدمیوں سے ہوگیا جو اچھے چلن کے آدمی نہیں تھے۔ جوا کھیلتے تھے اور چوری چکاری بھی کر لیتے تھے۔ یہ سب میری طرح کمین ذاتوں کے لوگ تھے۔ میری ہی طرح اپنے اپنے گاؤں سے بھاگ کر پیر کی بیٹھک میں آجاتے تھے۔ پیر ان سب کو بہت چاہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ پیر کے ساتھ راز کی باتیں بھی کرتے تھے۔ میں اُن میں گھُل مِل گیا اور اُنہوں نے مجھے بھی جوئے میں لگا لیا۔ مزار پر عورتیں آتی رہتی تھیں۔ ایک روز میں پیر کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔ گندم کی فصل بہت اُونچی ہوگئی تھی۔ ابھی رنگ زرد نہیں ہوا تھا۔ دُور دُور تک کھیت تھے۔ یہ گندم کا سمندر تھا....

"اچانک مینڈھ سے ایک جوان لڑکی اُٹھی۔ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ ڈیل ڈول اور کپڑوں سے اُونچی ذات کی معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے مُسکرا کر پوچھا، 'پیر جی کے ہاں جا رہے ہو؟' ــــ میں نے کہا 'ہاں' تو وہ بولی ــــ 'ذرا آہستہ چلو، میں بھی اُدھر ہی جا رہی ہوں' ــــ میں اُسے ساتھ لینے کے لئے رُک گیا تو اُس نے میرے ساتھ اس طرح باتیں شروع کر دیں جیسے وہ میرے گاؤں کی لڑکی ہو اور مجھے بچپن سے جانتی ہو۔ میں نے اُس سے گاؤں پوچھا تو اُس نے وہی گاؤں بتایا جسے ہم نے کبھی کبڈی نہیں جیتنے دی تھی۔ اُس نے اپنے باپ کا نام بتایا تو میں ڈر گیا۔ وہ اُونچی ذات کا بڑا اُونچا آدمی تھا۔ مجھے ڈرنا نہیں چاہیئے تھا کیونکہ میری نیت صاف تھی، لیکن وہ میرے ساتھ جا رہی تھی۔ دیکھنے والے شک میں میری بے عزتی کر سکتے تھے۔ وہ دیکھ لیتے تو ضرور کہتے، 'ارے کمین ذات، تیری یہ جرأت!'....

"میں نے لڑکی سے آگے نکل جانے کی کوشش کی تو اُس نے میرا بازو پکڑ لیا اور بولی ــــ 'مجھ سے بھاگ نہیں سکو گے' ــــ میں نے اُس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو دیکھا۔ وہاں مجھے کوئی اور ہی رنگ نظر آیا۔ میں ایسا بچّہ تو نہیں تھا۔

اُسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ شہزادی تھی اور میں غلام۔ وہ مجھے ہر طرح کا حکم دے سکتی تھی۔ اُونچی ذاتوں والے گناہ کرنے پہ آتے ہیں تو اپنا حق سمجھ کر گناہ کرتے ہیں۔ اُس نے کہا — 'تم ڈرے ڈرے سے کیوں ہو؟ کوئی پوچھ بیٹھے تو میں کہوں گی کہ مزار پر جا رہی ہوں۔ اسے ساتھ لے جا رہی ہوں'۔ وہ کہہ یہ رہی تھی کہ اونچے گھرانوں کی لڑکیاں کمین ذات کے مردوں کو اپنی حفاظت کے لئے ساتھ لے جایا کرتی ہیں .... ہم پیر کے ہاں پہنچ گئے اور وہ مجھ سے الگ ہو گئی ...

"پیر کے ہاں میرے جو دوست بن گئے تھے وہ مجھے پوری طرح اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ اُن کے ساتھ میری دوستی گہری ہو گئی تھی۔ اُنہوں نے مجھے راز کی باتیں بتانی شروع کر دیں۔ پیر نے بھی اُن کے کہنے پر میرے ساتھ دوستی کر لی۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے وہ پیر نہیں اور میں اس کا مُرید نہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ جُرم اور وارداتیں کرنے والے لوگ ہیں اور پیر انہیں پناہ دیتا ہے۔ پیر کی اس کرامت کو میں سچ مانتا تھا کہ وہ جنّات کو حاضر کرتا ہے۔ میں چار پانچ بار اس کا یہ کمال دیکھ چکا تھا۔ پہلی بار تو خوف سے میرا کلیجہ مُنہ کے راستے باہر آنے لگا تھا۔ ایک آدمی کو لائے جس پر جِنّ کا قبضہ تھا۔ اُسے رات کو بلایا گیا اور پیر نے اسے اپنی خاص بیٹھک میں بٹھایا۔ اس آدمی کے چھ سات رشتہ دار بھی ساتھ تھے۔ بیٹھک میں چند ایک مُرید بھی تھے۔ سب فرش پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ پیر قالین پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے اُونچے اُونچے گاؤتکیے تھے۔ پیر نے پہلے تو کچھ پڑھا پھر بلند آواز سے کہا — 'آجا — فوراً آ جا — میں دیکھتا ہوں تو کون ہے' ...

"گھنگروؤں کی دبی دبی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے کمرے میں ہر طرف دیکھا۔ تمام آدمی جو وہاں موجود تھے خوفزدہ ہو گئے۔ گھنگرو چھنکتے رہے اور کسی کے رونے کی آوازیں سُنائی دیں۔ آوازیں کمرے سے ہی اُٹھ رہی تھیں۔ کبھی یہ شک ہوتا کہ آوازیں پیر کے پیچھے سے آ رہی ہیں۔ میں ایسی جگہ بیٹھا تھا کہ گاؤتکیے اور اُن کے پیچھے مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ پیچھے کچھ

بھی نہیں تھا۔ وہ آدمی جس پہ جِنّ قابض تھے بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک گیا اور اُس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ پیر نے پوچھا — 'تو کہاں سے آیا ہے؟' — آواز آئی — 'اس کی منڈیر پہ میرا ڈیرہ ہے'۔ پیر نے پوچھا — 'اُسے کس قصور میں پکڑ لیا ہے'۔ آواز آئی — 'اس نے میرے سر پہ پاؤں رکھا تھا'۔ اِس طرح پیر کچھ نہ کچھ پوچھتا رہا اور کمرے کی فضا میں سے اٹھتی ہوئی ایک آواز اُسے جواب دیتی رہی۔ یہ مشہور تھا کہ جِنّ جب چلتے ہیں تو گھنگروؤں کی آواز آتی ہے۔ کمرے میں بھی گھنگروؤں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے بعد پیر نے اس آدمی کے ساتھ اور جِنّ کے ساتھ کیا سلوک کیا وہ بڑی لمبی بات ہے۔ میں نے چار پانچ بار جنّات کی آوازیں سُنیں ....

"اس کے بعد میں خود جِنّ بن گیا۔ میں نے گھنگرو بجائے اور جنّات کی زبان میں باتیں کیں۔ پیر نے مجھے اپنے خاص مُریدوں میں شامل کر لیا تھا۔ اُسے مجھ جیسے تنومند اور دلیر آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اُس کے پاس چار خاص مرید تھے۔ میں پانچواں ہو گیا۔ راز یہ تھا کہ پیر جہاں بیٹھتا تھا اس کے پیچھے فرش کھود کر اتنی کھلی جگہ بنائی گئی تھی کہ ایک آدمی آسانی سے اور آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ حاضرین کو کمرے میں بلانے سے پہلے اس جگہ ایک آدمی بیٹھ جاتا تھا۔ اُوپر موٹے سرکنڈوں کی چِک ڈال دی جاتی اور اس پر قالین بچھا دیا جاتا تھا۔ پھر حاضرین کو اندر بلایا جاتا۔ اور جب پیر جِنّ کو پکارتا تو قالین کے نیچے سے گھنگرو بجتے اور وہ آدمی ایسی آواز میں بولتا تھا جو مردانہ اور زنانہ آواز کے درمیان کی آواز ہوتی تھی۔ اس سے پہلے ہم یہ دیکھ آیا کرتے تھے کہ جس آدمی پر جِنّ کا قبضہ ہے اس کے گھر کے افراد کتنے ہیں اور کیا کیا ہیں اور اس کے مکان کا نقشہ کیسا ہے۔ ہم اس کے مطابق بات کیا کرتے تھے...

"میں تمہیں ایک ہی واقعہ سُنا دوں تو تم سارا ڈرامہ سمجھ لو گے۔ ایک عورت اپنے خاوند سے خوش نہیں تھی۔ خاوند سے طلاق بھی نہیں لے سکتی تھی۔ اُس کی آشنائی کسی اور کے ساتھ تھی۔ شادی ہوتے تین سال گزر گئے تھے۔ اس عورت نے پیر سے کہا کہ وہ کوئی ایسا تعویذ دے جس

کے اثر سے خاوند اسے طلاق دے دے۔ پیر نے اسے تعویذ دینے کی بجائے ایک ترکیب بتا دی۔ اُس کے مطابق عورت پر جن کا قبضہ ہو گیا۔ اُس نے ایسی کامیابی سے یہ ڈرامہ کھیلا کہ گھر والے پیر کے پاس بھاگے آئے۔ پیر نے انہیں تعویذ دیئے اور کچھ عمل بھی کیا۔ عورت نے اس کی ہدایت کے مطابق اپنا فریب جاری رکھا اور اپنا حُلیہ بگاڑ لیا۔ آخر اپنے خصوصی کمرے میں بلا کر پیر نے جن کو حاضر کیا۔ وہ جن میں تھا۔ میں نے قالین کے نیچے سے گھنگھرو بجائے اور پیر کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر اس کے خاوند نے اسے طلاق نہ دی تو میں اس کے خاوند کے سارے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔ اس کے ساتھ میں خود شادی کروں گا .... دیہات کے لوگ آج اتنی تعلیم کے باوجود اس خرافات کو مانتے ہیں۔ اس زمانے میں تو لوگ بالکل اَن پڑھ تھے۔ دوسرے ہی دن خاوند نے اسے طلاق دیدی۔ پیر نے اس عورت سے بہت زیادہ قیمت وصول کی جو اس نے بخوشی ادا کی ....

"پیر کا ایک جوان بیٹا تھا۔ لوگ بیٹے کی بھی عزت باپ جتنی کرتے تھے۔ لیکن باپ بیٹے میں ناچاقی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیر کی ایک بیوی بیس اکیس سال کی تھی اور بیٹے کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ باپ بوڑھا تھا۔ اُسے اپنے بیٹے اور اپنی چھوٹی بیوی پر شک تھا جو بالکل صحیح تھا۔ باپ اُن دونوں کے خلاف بول بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اُن دونوں کو باپ کی کرتوت کا سَو فیصد علم تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک رات ہم پیر کی فرمائش پر ایک ہندو لڑکی اٹھا لاتے اور پیر کے حوالے کی تھی اور رات ہی رات لڑکی کو وہیں چھوڑ آتے تھے جہاں سے اُٹھائی تھی۔ ہم مریدوں کے گھروں کی جاسوسی کر کے پیر کو بتاتے تھے اور وہ ہماری بتائی ہوئی باتوں کے مطابق انہیں غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ مرید حیران رہ جاتے تھے کہ پیر جی اُن کے گھر کی باتیں بھی جان لیتے ہیں ....

"پیر ہمیں بہت اُجرت دیتا تھا۔ لوگ اس کے آگے سجدے کرتے

تھے اور بے اولاد عورتیں اُس سے اولاد لینے آتی تھیں۔ لوگ اس کے باپ کے مزار پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ اصلی پیر ہم پانچ آدمی ہیں۔ اس دوران اس لڑکی نے مجھے کئی بار راستے میں روکا اور مجھے صاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ وہ میری آواز اور میرے جسم پر مرمٹی تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی مگر صرف پانچ مہینے خاوند کے گھر رہ سکی۔ برادریوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں نے انہیں جُدا کر دیا۔ لڑکی کے والدین نے ناک کی خاطر اُسے گھر بٹھا لیا اور لڑکے کے والدین نے اپنی ناک رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ لڑکی کو بسانا ہے تو بھیج دو، ورنہ گھر بٹھائے رکھو۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ بڑوں کی پرانی سیاست بازیوں نے نوجوان لڑکی کو اُجاڑ دیا۔ وہ خاوند کے پاس جانا چاہتی تھی مگر والدین جانے نہیں دیتے تھے۔ ایک بار اُس نے ضِد کی تو باپ نے اس کی پٹائی کر دی۔ لڑکی مُنہ زور ہو گئی۔ اُس نے چوری چھُپے خاوند کو پیغام بھیجا کہ تم میں غیرت ہے تو آکر مجھے لے جاؤ۔ خاوند نے جواب دیا کہ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔ اپنے باپ سے کہو کہ تمہیں میرے گھر چھوڑ جائے۔ سمجھوتے کی اُمید ٹوٹ چکی تھی ....

"میں نے لڑکی کی محبت قبول کر لی۔ یہ سَولہ آنے پاک محبت تھی۔ وہ مجھے کہتی تھی کہ آؤ کہیں بھاگ چلیں۔ وہ اُونچی ذات کے امیر باپ کی بیٹی تھی۔ کہتی تھی کہ سارا زیور اور بہت ساری نقدی ساتھ لے آؤں گی۔ میں ڈرتا تھا۔

ایک روز وہ مجھے مزار کے راستے میں ملی اور بولی — 'میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔ گھر سے نکل آئی ہوں' — وہ گھر سے مزار پر سلام کرنے کے بہانے آئی تھی۔ میں نے اُسے گھر چلے جانے کو کہا مگر وہ نہ مانی۔ اُس نے بتایا کہ آج ماں نے بھی اور باپ نے بھی اُسے بہت پیٹا ہے کیونکہ اُس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے پاس جانا چاہتی ہے۔ ایسی جرأت کون برداشت کرتا ہے۔ وہ گھر سے کچھ نقدی لے آئی تھی۔ اُس نے مجھے یہ بھی کہا — 'میں تمہیں بڑا جابر مرد سمجھتی ہوں۔ عورتوں کی طرح پیٹھ نہ دکھانا' — میں نے اسے کہا کہ میں کمین ذات کا آدمی ہوں اور تم بہت اُونچے گھر کی لڑکی ہو۔ اس نے کہا — 'تم سے اُونچا کوئی نہیں' — اُس نے ایسی باتیں کیں کہ میں نے اُس

کا ہاتھ تھام لیا....

"میں آگے آگے پیر کے پاس پہنچا۔ وہ مزار پر چلی گئی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہاں میرا انتظار کرے۔ میں نے پیر کو ساری بات سُنادی اور کہا کہ لڑکی کو کہیں چھپالو۔ پیر نے جب یہ سُنا کہ لڑکی فلاں گھر کی ہے تو وہ گھبرا گیا اور کہنے لگا — "تم کمین ذات کے ہو اور لڑکی بہت اُونچے گھر کی ہے۔ اگر پکڑے گئے تو وہ لوگ تمہاری بوٹیاں، اپنے کُتوں کو کھلا دیں گے۔ اسے واپس بھیج دو"— میں نے اسے کہا کہ میں تین چار دِن اُسے یہاں رکھوں گا اور سوچوں گا کہ کیا کروں۔ جنوں کا کوئی ناٹک کھیلیں گے یا کہیں چلے جائیں گے۔ پیر نے مجھے نصیحت کی کہ کسی کی بیٹی کو چھپاتے رکھنا بہت بُرا کام ہے۔ تب میں نے پیر سے کہا — "میں نے آپ کے لئے اس سے زیادہ بُرے کام کئے ہیں۔ میں اس لڑکی کو بیچوں گا نہیں۔ شادی کر کے اس کا جسم اپنے اُوپر حلال سمجھوں گا"— پیر کی دُکھتی رگیں میرے ہاتھ میں تھیں۔ وہ مان گیا۔ کہنے لگا لڑکی کو لاؤ۔ میں نے مزار پر جا کر لڑکی سے کہا کہ میرے پیچھے آجائے....

"پیر نے جب لڑکی کو دیکھا تو اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ پیر نے جلال میں آکر کہا— "تم نے ہم سے پناہ مانگی ہے۔ ہم تم دونوں کو اپنے سینے میں چُھپا کر رکھیں گے اور اپنے ہاتھ سے تمہارا نکاح پڑھائیں گے"۔ اور ہوا بھی یُوں ہی۔ پیر کا مکان بہت بڑا تھا۔ اُس نے مجھے ایک ایسا کمرہ دے دیا جہاں کوئی اور نہیں جاتا تھا۔ دوسرے دن اُس نے اکیلے ہی ہمارا نکاح کر دیا۔ ہم سے کلمے پڑھوائے اور ایجاب و قبول کرا لیا... اب اگر تم مجھ سے پوچھو کہ میں نے اس سے آگے کیا سوچا تھا تو میں کوئی جواب نہیں دے سکوں گا۔ وہ جوانی کا جوش تھا۔ خالص دُودھ، گھی اور ورزش نے مجھے چیتے کی طاقت اور دلیری دے رکھی تھی۔ عقل اندھی تھی۔ میں نے اس کے سوا اور کچھ بھی نہ سوچا کہ میں شیر مرد ہوں اور اتنے اُونچے گھر کی اتنی خوبصورت لڑکی میرے پیچھے گھر سے نکل آئی ہے۔ میں نے پیر سے مشورہ کیا تو اُس نے یہ کہہ کر میرا حوصلہ بڑھا دیا کہ غم نہ کر، یہاں تمہیں جن بھی نہیں دیکھ سکتے....

"دوسرے ہی دن لڑکی کی ماں پیر کے پاس آئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیوں آئی ہے۔ اُس نے ایک خبر یہ سنائی کہ اُس کی لڑکی کے خاوند نے خودکشی کر لی ہے۔ میں نے لڑکی کو بتایا تو اُس پر کچھ بھی اثر نہ ہُوا۔ میں خوش ہُوا کہ اب یہ لڑکی بیوہ ہو کر مجھ پر حلال ہو گئی ہے۔ بعد میں پیر نے مجھے بتایا کہ ماں یہ سوال لے کر آئی تھی کہ جنات سے پوچھ کر بتاؤ کہ لڑکی کہاں چلی گئی ہے۔ پیر نے اُسے بتایا کہ ابھی یہ معلوم نہیں کہ کہاں گئی ہے۔ صرف یہ پتہ چلا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ پانچ چھ روز یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے لڑکی کو چھپائے رکھا۔ چھٹی یا ساتویں رات گزری تو قیامت آگئی۔ کسی نے بتایا کہ پیر اپنے اس کمرے میں مرا پڑا ہے جہاں وہ جنات کو حاضر کیا کرتا تھا۔ میں نے جا کر لاش دیکھی۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مُنہ بھی کُھلا ہُوا تھا اور لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ آگ کی طرح سارے علاقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ سرکار قتل ہو گئے ہیں۔ ہزاروں مُرید جمع ہو گئے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ عورتیں بَین کر رہی تھیں۔ مجھے یہ ڈر کہ لڑکی کو کوئی نہ دیکھ لے۔ میں نے اُس کمرے کو جس میں اُسے چھپایا ہُوا تھا، باہر سے تالا لگا دیا۔ اگر کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے تو وہ پیر کا بیٹا تھا اور پیر کی چھوٹی بیوی۔ پیر کے بیٹے نے کئی بار کہا کہ یہ جنات کی کارستانی ہے....

"پولیس آگئی۔ پیر کے بیٹے نے تھانیدار سے بھی یہی کہا کہ آپ لوگ اپنا وقت ضائع نہ کریں، پیر کو کوئی انسان قتل نہیں کر سکتا۔ یہ جنات کا کام ہے۔ میرے والد صاحب کے قبضے میں بڑے بڑے مُنہ زور جن تھے۔ ایسا کوئی جن قبضے سے نکل گیا اور انہیں مار گیا ہے۔ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اندر جا کر پولیس نے کیا کارروائی کی۔ تھانیدار ہندو تھا۔ وہ بہت دیر تک پیر کے بیٹے کے ساتھ اندر بیٹھا رہا۔ لاش کو اندر چُھپا لیا گیا۔ سب کو معلوم تھا کہ لاش پوسٹمارٹم کے لئے جائے گی۔ یہ کسی کو بھی پسند نہیں تھا کہ پیر کی لاش کی بے حُرمتی ہو مگر پولیس کو اپنی کارروائی پوری کرنی تھی۔ تین چار گھنٹوں بعد

تھانیدار باہر نکلا اور وہ اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کے چلا گیا۔ لاش کمرے میں پڑی رہی جسے احترام سے پلنگ پر رکھ دیا گیا تھا۔ پیر کے بیٹے نے اعلان کیا کہ اس کے باپ کی موت جنّات کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ مُریدوں پر خوف طاری ہو گیا۔ کوئی ایک بھی نہیں تھا جس نے یہ کہا ہو کہ پیر کو کسی نے قتل کیا ہے۔ بیٹے نے اپنے خاص مُریدوں کی زبانی مشہور کرایا کہ اس نے باپ کے تمام جنّات اپنے قبضے میں لے لئے ہیں اور وہ اپنے باپ کے قاتل جنّ کو زندہ نہیں چھوڑے گا....

"پیر کی لاش کو میں نے ایک خاص مُرید کے ساتھ آخری غُسل دیا اور کفن پہنایا۔ بڑی شان سے جنازہ اُٹھا اور اسے اس مقبرے میں دفن کر دیا گیا جہاں اس کا باپ دفن تھا۔ مزار کی وقعت اور زیادہ بڑھ گئی۔ کیونکہ اس میں اب دو پیر دفن تھے۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ لڑکی جو اب میری بیوی بن چکی تھی پکڑی جائے گی۔ پیر کے بیٹے کو معلوم نہیں تھا کہ میں نے ایک کمرے میں ایک لڑکی کو چھپا رکھا ہے۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ میں اُس کے باپ کے خاص مُریدوں میں سے ہوں۔ ایسے مُریدوں کی ضرورت بیٹے کو بھی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی دوستی میں شامل کر لیا۔ اپنے باپ کی بڑی بیوی کو اُس نے الگ مکان دے دیا اور چھوٹی بیوی کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ یہ دونوں اُس کی سوتیلی مائیں تھیں۔ چھوٹی بیوی اُس کی ہم عمر تھی۔ اسی پر باپ بیٹے کی بول چال بھی بند تھی۔ یہ لڑکی پیر کے بیٹے کو پسند کرتی تھی۔ بیٹا ابھی غیر شادی شُدہ تھا....

"میں نے اُسے بتا دیا کہ اس کے مکان کے ایک کمرے میں میں نے ایک لڑکی کو چھپا رکھا ہے جو میرے پیچھے گھر سے بھاگ آئی ہے اور اب میری بیوی ہے۔ اُس نے کہا کہ لڑکی دکھا دو۔ میں اُسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اُس نے ہنس کر کہا ـــ 'اوئے کمین! تیری یہ قسمت؟ یہ اس گدّی کی برکت ہے۔ ہماری خدمت کرے گا تو اس سے زیادہ عیش کرے گا' ـــ اس نے لڑکی کے سر پر اور گالوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھے عجیب سی

نظروں سے دیکھتا باہر نکل گیا۔ لڑکی بہت ڈری ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے کہا کہ یہاں ایک دن بھی رہنا ٹھیک نہیں، یہ شخص اپنے باپ سے زیادہ بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔ بیٹے نے اُسی روز اپنی نیّت ظاہر کر دی۔ وہ جوان اور دلیر تھا۔ دلیری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگوں نے اُسے پیر تسلیم کر لیا تھا۔ اُس نے مجھے الگ بلا کر کہا ـــ 'لڑکی کا گاؤں دُور نہیں۔ اس کا سارا خاندان ہمارا مُرید ہے۔ ہم لڑکی کی ہوا بھی باہر نہیں جانے دیں گے۔ گھبرانا نہیں۔ صرف یہ خیال رکھنا کہ تم اسے صرف اپنی بیوی نہ سمجھنا۔ اپنے مُرشد کا بھی کچھ خیال کرنا....

"میری غیرت جوش میں آئی لیکن میں نے اپنے اُوپر جبر کیا اور اُسے دھوکہ دینے کے لئے کہا ـــ 'ہم سرکار کے غلام ہیں۔ ایسی بات جتلانے کی ضرورت ہی کیا تھی' ـــ وہ بہت خوش ہُوا۔ میں نے اُس سے کہا کہ مجھے کچھ رقم چاہیئے۔ میں نے دو سَو روپے مانگے جو اُس نے فوراً دے دیئے۔ آج کل دو سَو روپوں کی تو کوئی قیمت ہی نہیں۔ اُس زمانے کے دو سَو روپے آج کے دو ہزار کے برابر تھے۔ لڑکی کے پاس بھی کچھ رقم تھی جو وہ گھر سے لائی تھی۔ رات کو جب پیر کا بیٹا شراب پی کر اپنی ہم عمر سوتیلی ماں کے کمرے میں چلا گیا اور خاص مُرید بھی رخصت ہو گئے تو میں نے لڑکی کو ساتھ لیا اور ایسے سفر پر روانہ ہو گیا جس کی منزل کا مجھے علم نہیں تھا۔ ہم دونوں مجرم تھے۔ منزل موت ہو سکتی تھی۔ میں گنوار دیہاتی تھا۔ دیہات کے باہر کی دُنیا کو میں نہیں جانتا تھا۔ ہم پیدل ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے جو وہاں سے چار میل دُور تھا۔ چاندنی رات تھی۔ ہم کھیتوں میں جا رہے تھے۔ میں نے کئی بار پیچھے دیکھا۔ مجھے مزار کا گنبد دُور تک نظر آتا رہا۔ اسے لوگ خانہ کعبہ سمجھتے تھے۔ وہاں سجدے کرتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ اُنہیں کون بتاتا کہ یہ گدّی بدکاری کا اڈہ ہے اور یہاں کسی کی بہن، بیٹی، بہو اور بیوی کی عزّت محفوظ نہیں اور اس گدّی کے قید خانے میں کوئی جنّ قید نہیں اور پیر کو کسی جنّ نے نہیں ایک انسان نے قتل کیا ہے۔ تم سوچو، اگر میں

لوگوں کو بتاتا کہ میں وہ جن ہوں جو اس گدی کے قبضے میں تھا اور میرے
چار ساتھی جن تھے تو کیا لوگ مان لیتے؟ تم میری کہانی لوگوں کو سنانا۔
کوئی بھی نہیں مانے گا۔ زمانہ کتنی ترقی کر گیا ہے مگر ہندوستان اور
پاکستان کے مسلمان ابھی تک پیروں کے آگے سجدے کر رہے ہیں۔
ابھی تک مزاروں پر چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اُن کی بہو بیٹیاں
پیروں کے خاص حجروں میں جا رہی ہیں....

"لوگ جس مزار پر سلام کر کے لمبے سفر پر روانہ ہوتے تھے میں اُس
مزار پر سَو سَو لعنتیں بھیج کر بڑے ہی لمبے اور خطرناک سفر پر روانہ ہوا۔ میرا پیر
اور مُرشد اللہ کی ذات اور اس کا رسول تھا۔ دل میں انہی کا نام تھا۔ میں نے
گناہ کیا تھا۔ ایک لڑکی سے اُس وقت شادی کی تھی جب اُس کا خاوند زندہ تھا جو گھر
سے بھاگ آئی تھی۔ میرے جاہل دماغ میں یہ ارادہ بھی آیا کہ لڑکی کو اس کے
گاؤں لے جاؤں اور اُسے سب کے سامنے کھڑا کر کے کہوں کہ یہ دیکھ لو
اُونچی ذاتوں والے بادشاہو! یہ دیکھ لو اپنی عزت اور غیرت جسے تمہاری
ناک اور تمہاری سیاست بازیوں نے ایک کمین ذات کے پاؤں میں بٹھا دیا
ہے۔ اُن بدبختوں نے اسے اپنی عزت سمجھا تھا کہ اپنی بیٹی کو خاوند کے پاس
نہ بھیجیں اور خاوند نے اپنی بیوی کو گھر لے جانے میں اپنی بے عزتی سمجھی تھی۔
جوان لڑکی رُوح اور جسم کی پیاس کو برداشت نہ کر سکی اور جو آدمی اُس کے
دل کو اچھا لگا اُس کے پاس پہنچ گئی.... میرے دماغ میں بہت سی سوچیں
آئیں۔ اپنے انجام کے متعلق میں کچھ علم نہیں رکھتا تھا۔ میں نے خُدا سے
بخشش مانگی۔ اُسی سے مدد مانگی۔ مجھے بالکل اُمید نہیں تھی کہ خُدا مجھے بخش
دے گا کیونکہ میں گناہگار تھا....

"پھر بھی بھروسہ اسی کی ذات پر تھا۔ رات کو ہم سٹیشن پر پہنچ گئے۔
لڑکی نے چادر لپیٹ رکھی تھی۔ میں نے بھی سر اور چہرہ چادر میں چھپا لیا تھا۔ کچھ
پتہ نہ تھا کہ کہاں جانا ٹھیک رہے گا۔ لڑکی کے مُنہ سے نکلا "دلی" کا ٹکٹ لے
لو — دلی نہ اس نے دیکھی تھی نہ میں نے۔ ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ بہت دُور

چلے جائیں۔ اس علاقے میں رُکنا خطرناک تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ دلی سے دُور اور
کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ دلی کے متعلق ہم یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کا شہر ہے۔ معلوم
نہیں مجھے کیوں اطمینان ہو گیا کہ ہمیں دلی کے سوا اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی
...... گاڑی آنے میں ابھی دو گھنٹے پڑے تھے۔ ہم اندھیرے میں بیٹھے رہے۔
لڑکی مجھ سے زیادہ دلیر تھی۔ وہ میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ میں نے سٹیشن کے
ایک آدمی سے پوچھ لیا کہ دلی تک میں کس طرح پہنچ سکتا ہوں۔ مجھے ڈر
تھا کہ یہ گاڑی کہیں بدلنی نہ پڑے۔ اُس نے بتایا کہ یہ گاڑی سیدھی دلی
جاتے گی اور اگلے روز دوپہر کو پہنچے گی.... وقت ہوا تو میں نے دو ٹکٹ
لے لئے۔ اس زمانے میں گاڑیوں میں بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔ رات کی گاڑیوں
کے ڈبے عموماً خالی ہوتے تھے۔ ہم ایک ڈبے میں بیٹھ گئے اور گاڑی ہمیں
ایک خطرے سے نکال کر اُن خطروں کی طرف لے گئی جن کے متعلق مجھے
معلوم نہ تھا کہ کیسے ہوں گے....

"اس اجنبی دیس میں پہنچے۔ اتنا بڑا ریلوے سٹیشن دیکھ کر طبیعت دنگ
رہ گئی۔ گھبراہٹ یہ تھی کہ کہاں جائیں۔ خدا نے ہماری مدد کی۔ اس نے سٹیشن
پر ہی اپنا ایک بندہ ملا دیا جو ہمارے لئے فرشتہ ثابت ہوا۔ میں نے اُسے
بتایا کہ میں روزگار کی تلاش میں دلی آیا ہوں۔ وہ بہت ہی نیک آدمی تھا۔
اُس نے میری بیوی کو دیکھا تو شاید اُس نے محسوس کیا ہو گا کہ اتنی خوبصورت
لڑکی کو ساتھ لئے ہوئے یہ آدمی اتنے بڑے شہر میں خراب ہو گا۔ مجھے معلوم
نہیں کہ اُس شخص کے دل میں یہ شک کیوں نہ پیدا ہوا کہ میں کوئی مشتبہ آدمی
ہو سکتا ہوں اور یہ لڑکی میری بیوی نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا
اور ایک بہت بڑے آدمی کے سامنے پیش کیا۔ اس کا بنگلہ تھا جس کے آگے
کوئی ڈیڑھ کنال کا باغیچہ اور سبزیوں کا باغ تھا۔ اُسے ایسے آدمی کی ضرورت
تھی جو اس باغ کو بنائے سنوارے اور بھینس کو بھی سنبھالے۔ اُسے جو بھی مالی
اور نوکر ملا وہ یا بھاگ گیا یا بیکار ثابت ہوا۔ مجھے دیہاتی جان کر اُس نے مجھے
رکھ لیا اور ہمیں بنگلے کے ساتھ ایک کوارٹر دے دیا....

"میں آج اُس وقت کو یاد کرتا ہوں تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے خواب دیکھا تھا۔ یہ معجزہ تھا کہ پردیس میں قدم رکھا اور ایک آدمی نے اس طرح پناہ میں لے لیا جیسے خُدا نے اُسے میرے انتظار میں میرے راستے میں کھڑا کر دیا تھا۔ یہ کون سی نیکی کا اجر خُدا نے دیا تھا؟ — مجھے ایسی کوئی نیکی یاد نہیں آتی۔ میں تو پکا پاپی تھا۔ کمین تھا۔ میں نے بنگلے کا باغیچہ سنبھال لیا اور خُدا کے آگے سر جھکا دیا۔ مجھے چونکہ وہاں سے بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی نہ کہیں بھاگ کر ہم جا سکتے تھے، اس لئے ہم دونوں نے مل کر باغ کو صحیح معنوں میں باغ بنا دیا۔ سبزی اتنی اُگانے لگے کہ میں ہر روز بے شمار سبزی بازار لے جاتا اور دکانداروں کو دے کر سارے پیسے مالک کے حوالے کر دیتا۔ بھینس کو بھی ہم نے سنبھال لیا۔ وہ بڑا ہی نیک خاندان تھا۔ اُنہوں نے ہم دونوں کی نیّت اور محنت دیکھ کر اپنے خاندان میں شامل کر لیا۔ ہم برائے نام نوکر تھے۔ اُس گھر کی عورتیں میری بیوی کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتی تھیں۔ تم اس لڑکی کے متعلق سوچو جو اتنے اُونچے گھرانے کی تھی۔ وہ محبت کی خاطر کس قسم کی نوکری کر رہی تھی۔ وہ کمین ذات کی لڑکی بن گئی تھی۔۔۔

"ایک روز، کوئی دو سال بعد، بنگلے کے مالک نے کہا کہ گھر سے پتہ چلا ہے کہ تمہاری بیوی امیر زمیندار کی بیٹی ہے۔ میری بیوی نے اُس کی بیٹیوں کو بتا دیا تھا کہ وہ میرے پیچھے گھر سے نکل آئی تھی۔ میں نے چھپانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اُسے یہ سارا قصّہ سُنا دیا جو تمہیں سُنایا ہے۔ بالکل اسی طرح، ایک ایک لفظ یہی تھا جو اُسے سُنایا۔ پیر کی اصلیت بھی بتائی اور اپنی کرتُوت بھی بتائی۔ پیر کے بیٹے اور اُس کی چھوٹی بیوی کے متعلق بھی بتایا اور پیر کے قتل کی واردات بھی سُنائی اور یہ بھی سنایا کہ پیر کے بیٹے نے پولیس کے ساتھ مل کر قتل کو چھپایا اور یہ مشہور کر دیا تھا کہ اُسے جنات نے قتل کیا ہے حالانکہ اُس کے قبضے میں کوئی جن نہیں تھا اگر کوئی جن تھا بھی تو وہ ہم پانچ گناہگار آدمی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ قاتل کون ہے لیکن میں نے اُسے یہ نہیں بتایا۔"

میں نے یہاں چچا ماجد کو روک دیا اور کہا — "آپ نہ بتائیں تو بھی صاف ظاہر ہے کہ قاتل پیر کا اپنا بیٹا تھا۔"

چچا ماجد ہنس پڑا اور بولا — "حاجی صاحب (بنگلے کے مالک) نے بھی یہی کہا تھا۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ پیر کو اُس کے بیٹے نے اُس کی چھوٹی بیوی کی خاطر اور گدّی کی خاطر قتل کیا ہے۔ اُس نے تھانیدار کو رشوت دے کر یہ ثابت کرا لیا ہوگا کہ پیر کو جنات نے قتل کیا ہے۔ میں نے حاجی صاحب سے کہا تھا کہ بات کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے، حالانکہ قاتل اُس کا بیٹا نہیں تھا۔"

"اور کون ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟" چچا ماجد نے کہا — "اُسے میں نے قتل کیا تھا۔"

میں چونک اُٹھا۔ اُس نے کہا — "آج پہلی بار یہ راز میرے سینے سے باہر آیا ہے۔ خدا کے بعد یہ راز صرف میری بیوی جانتی ہے۔ آج ساری واردات سُناتے سُناتے دل اتنا اُبل آیا ہے کہ یہ راز باہر نکالنے کی خواہش تڑپ اُٹھی ہے۔ آدھی صدی پہلے کا قتل دِل میں کانٹے کی طرح اُترا ہُوا تھا۔ آج میں نے یہ کانٹا نکال دیا ہے۔"

"قتل کی وجہ کیا تھی؟"

"تم نے غور نہیں کیا" اُس نے کہا — "لڑکی میرے پیچھے نکل آئی تو میں نے پیر کو بتایا۔ اُس نے مجھے ڈرایا اور کہا کہ لڑکی کو واپس بھیج دو، مگر اس نے لڑکی دیکھی تو مست ہو کر کہا کہ ہم تم دونوں کو پناہ دیں گے۔ اُس نے خود ہی ہمارا نکاح پڑھا دیا۔ میں اُس کی نیّت سمجھ گیا تھا۔ میں پہلے دن ہی اس سوچ میں پڑ گیا تھا کہ لڑکی کو کہاں لے جاؤں۔ اسی میں پانچ چھ دن گزر گئے۔ ایک رات پیر نے مجھے باہر کے ایک کام پر بھیج دیا۔ کام ایسا تھا کہ میں ساری رات باہر رہتا۔ میں چلا گیا۔ راستے میں مجھے خیال آگیا کہ پیر اس کام پر مجھے دن کو بھی بھیج سکتا تھا۔ مجھے شک ہُوا کہ وہ مجھے رات

کو غیر حاضر رکھنا چاہتا ہے۔ میں راستے سے واپس آگیا۔ اپنے کمرے میں گیا تو میری بیوی وہاں نہیں تھی۔ میرا شک پکّا ہوگیا۔ میں بیوی کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھُوما۔ پیر کے اُس خاص کمرے سے جہاں وہ جنّ حاضر کیا کرتا تھا مجھے آوازیں سنائی دیں۔ دروازے پر ہاتھ رکھا تو کواڑ کھُل گئے۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ پیر میری بیوی کو بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھا اور میری بیوی اُسے گالیاں دے رہی تھی اور اُس سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا تھا کہ اُس نے میری بیوی کو کسی بہانے اُس کمرے میں بلایا تھا۔۔۔

"میں جانتا تھا وہ کتنا کچھ پہنچ والا پیر ہے۔ غیرت کے جوش نے مجھے اندھا کر دیا۔ میں نے پیچھے سے اُس کی گردن دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی اور اتنی زور سے دبائی کہ اس کے بازوؤں سے لڑکی نکل گئی۔ میں نے گردن چھوڑی نہیں۔ میرے جسم میں لوہے کی طاقت تھی۔ پیر تڑپا۔ اُس کے خرّاٹے نکلے پھر وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ جب چھوڑا تو وہ گر پڑا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ بیوی کو ساتھ لئے میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میری بیوی بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ کہتی تھی کہ پیر انتقام لے گا، اس کے قبضے میں جنّات ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ نہ پیر ہے اور نہ اس کے پاس جنّات ہیں۔ وہ یہی کچھ ہے جو تم نے دیکھ لیا ہے۔ میں اُس سے صبح بات کر کے یہاں سے نکلوں گا۔۔۔ مجھ میں جوانی اور جسم کی طاقت کی دلیری تھی۔ رات وہیں گزار دی۔ صبح ان آوازوں پر میری آنکھ کھلی۔

'سرکار مارے گئے۔۔۔۔ لاش فرش پر پڑی ہے' — میں نے جا کر دیکھا۔ لاش اسی طرح پڑی تھی جس طرح وہ رات گرا تھا۔ وہ شاید میرے ہاتھوں میں ہی مر گیا تھا۔ میرا پسینہ نکل آیا۔ میری بیوی کی حالت اور زیادہ بُری ہو گئی۔ ہم اُسی وقت بھاگ نہیں سکتے تھے ورنہ پکڑے جاتے اور قتل کا شک ہم پر ہوتا۔۔۔۔

"اتنے میں پیر کے بیٹے نے مشہور کر دیا کہ یہ جنّات کی کارستانی ہے۔

تم حیران ہوتے ہوگے کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ وجہ بڑی صاف ہے۔ باپ بیٹے میں دشمنی تھی۔ بیٹا باپ کی گدّی پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ عام مُریدوں کو اس دشمنی کا علم نہیں تھا۔ بیٹا جدھر جاتا تھا لوگ اس کے آگے سجدے کرتے تھے۔ یہ صرف ہم پانچ خاص مُریدوں کو معلوم تھا۔ باپ کے قتل سے اس نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ لوگوں کے دلوں پر یہ رعب طاری کر دیا کہ اس گدّی کے قبضے میں بڑے بڑے خطرناک جنّ ہیں۔ وہ یہ بھی ثابت کرنا چاہتا تھا کہ پیر کو کوئی انسان قتل نہیں کر سکتا۔ اُس نے تھانیدار کو منہ مانگی رشوت دی اور قتل کی واردات تھانے کے کاغذوں میں جانے ہی نہ دی۔ گدّی سنبھالتے ہی اُس نے اعلان کیا کہ اُس کے باپ کے تمام جنّ اُس کے قبضے میں آ گئے ہیں اور وہ باپ کے قاتل جنّ کو سزا تے موت دے گا۔ باہر تو وہ یہ اعلان کرتا تھا جس کا اثر یہ ہُوا کہ سیدھے سادھے لوگ اُس کی عزّت اور عبادت اتنی زیادہ کرنے لگے جتنی اُنہوں نے اُس کے باپ کی بھی نہیں کی تھی۔ مگر اندر اندر وہ ہم سے پوچھتا تھا کہ سراغ لگاؤ کہ قاتل کون ہے۔

میں فوراً ہی وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ بعد میں وہاں معلوم نہیں کیا ہُوا۔"

"آپ پاکستان میں کب آتے تھے؟" میں نے پُوچھا۔

"یہ ایک اور کہانی ہے۔" اُس نے کہا — "پھر کبھی سُن لینا۔ البتہ یہ ضرور سناؤں گا کہ خدا نے مجھے معاف نہیں کیا۔ میرے چار بچے پیدا ہوئے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ کوئی بھی تین سال سے زیادہ زندہ نہیں رہا۔ میں اتنا بوڑھا نہیں جتنا نظر آتا ہوں۔ اولاد کے غم نے ضعیف کر دیا ہے۔ میری بیوی کو دیکھو۔ اس کا بھی یہی حال ہے۔"

میں نے اُس کی بیوی کو دیکھا۔ بڑھاپے میں بھی اُس کے چہرے پر خوبصورتی اور خودداری کے آثار موجود تھے۔